اَخلاقیاتِ اسلام میں علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی انفرادیت

The uniqueness of the 'philosophy of the self' in the moral philosophy of Islam

☆ شفاقت علی

☆☆ ڈاکٹر علی اَکبر الاَزہری

ABSTRACT

Allama Iqbal is a modern poet and philosopher of the Muslim world who belongs to the twentieth century AD. Allama Iqbal is equally popular in the east and west, due to his immortal poetry and deep philosophical approach. Ethics has been an essential part of every religion & civilization throughout the human history. That is why, so many Muslim and non-Muslim philosophers have been giving their ethical theories. Being a prominent philosopher of the east, Allama Iqbal also gave his ethical theory. The ethical ideology of Allama Iqbal is called "Khudi" that consists of three steps named as; God's obedience, self-control and Khilafah of God. Regarding the completion of the ethics, the ideology of Allama Iqbal is closer to Islam, easy to understand and applicable. It is useful not only for individual but also for a nation or community. By following this theory a person or a nation can be successful in this world as well as in hereafter world.

Keywords: Iqbal, Self-esteem, Poetry, Struggle.

علامہ اقبالؒ نے اس وقت آنکھ کھولی جب مشرق پر عموماً اور عالم اسلام پر خصوصاً حزن و یاس کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سب سے بُری حالت ہندوستان کے مسلمانوں کی تھی۔ جہل اور غلامی کی بدولت ان کے دلوں میں زندگی کی آگ سرد پڑ چکی تھی۔ انگریز فاتحین کی ہیبت اور مغربی تمدن کا دبدبہ ان کے دل و دماغ پر غالب تھا۔ مختلف مشاہیر اُمت اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے کوشاں تھے مگر اس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے جس دور رس فلسفیانہ نگاہ کی ضرورت تھی وہ علامہ اقبال کے پاس تھی۔ انھوں نے عالم اسلام پر نگا ہ ڈالی تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے موجودہ زوال کا سبب"جسمانی تعیش اور کاہلی" سے زیادہ

☆ پی۔ایچ۔ڈی اسکالر، یونیورسٹی آف لاہور

☆☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، گیریژن یونیورسٹی، لاہور۔

"روحانی تعیش اور جمود" ہے جو ان میں "وحدت الوجود" کے عقیدے میں غلط فہمیوں کے عام ہونے کی وجہ سے پیدا۔ یہ عقیدہ نو افلاطونیت کے راستے اسلام میں داخل ہوا جس کی اصل افلاطون کا فلسفہ عینیت ہے۔اس عقیدے نے خودی یا انفرادی نفس کے وجود کو باطل قرار دے کر مسلمانوں کے دلوں میں فرد کی اخلاقی ذمہ داری کا احساس مٹادیا اور سعی و عمل کے ذوق کو فنا کردیا۔اپنی خودی کا انکار کر کے مسلمان اپنی عظمت و شوکت کھو بیٹھے اور ذلت و پستی کی انتہا کو پہنچ گئے۔ قوموں کے عروج اور زوال کی داستان اقبال کے نزدیک ان کی خودی کے استحکام اور ضعف کی داستان ہے۔ صرف وہی قوم دنیا میں قوت و شوکت کے ساتھ زندہ رہتی ہے، جو اپنی خودی کو پہچان کر اس کو مستحکم کرتی ہے۔اقبال کے نزدیک جو قوم اپنی خودی یعنی قوت محرکہ کو نہیں پہچانتی اور اس کے ضعف کے اَسباب سے آگاہ نہیں ہوتی وہ حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ پس مسلمانوں کے زوال کی اصل وجہ سیاسی و معاشی بحران نہیں بلکہ خودی کا ضعف یا اس کی نفی ہے۔

علامہ اِقبال نے زندگی کے مسائل پہ اتنا کچھ کہا اور لکھا ہے کہ اُسے ضبط کرنے کے لیے ایک عُمر چاہیے۔ قومیں کیسے بنتی اور بگڑتی ہیں ؟ انہیں توانائی کہاں سے ملتی ہے؟ زندگی کی منزل کون سی ہے؟ حیات کا سوز کیا اور ساز کیاہے؟جمال کیا ہے اور جلال کیا ؟ خودی کیسے پختہ و محکم بنتی ہے؟ میری وفقیری میں کیا رشتہ ہے؟ امنِ عالم کو لادین سیاست سے کتنا نقصان پہنچا؟ تہذیب فرنگ نے انسان کو کن پستیوں میں دھکیلا؟ یہ اور اِس قسم کے دیگر مسائل مثلاً اشتراکیت، سرمایہ داری، زمان و مکان، علم و عشق، تصوف، نوفلاطونی تصورات، عجمی اثرات وغیرہ پر وہ کچھ کہا ہے کہ ہر ارشاد حرفِ آخرکی حیثیت رکھتا ہے۔جس طرح یونانِ قدیم میں سقراط،افلاطون اور ارسطو یہ تین ایسے فلسفی تھے جن کی فکری عظمت سے دنیا صدیوں مرعوب رہی اور کسی فلسفی کو اُن سے اختلاف کی جُرات نہ ہو سکی۔ یہی مقام آج دنیائے اسلام میں اِقبال کو حاصل ہے۔

علامہ اقبالؒ کا فلسفہ خودی:

علامہ اقبال کے تمام نظریات میں سے سب سے اہم نظریہ خودی ہے۔ اُن کی شاعری میں خودی کو وہی مقام حاصل ہے جو مادے میں روح کو اور جسم میں دماغ کو ہے۔ اُن کے نزدیک یہ وہ گوہرِ بے بہا ہے جو انسانیت کا جوہر اور زندگی کا ماحصل ہے۔ وہ اس متاعِ گم گشتہ کی بازیافت کے لیے انداز بدل بدل کر مسلمانوں کو اُکساتے ہیں۔ چنانچہ اس نظریہ خودی کا پر چار کرنا علامہ اقبال کا خاص مطمع نظر تھا۔ اسی کے

معنی و مفہوم کی وضاحت و تشریح کے لیے اُنہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور قوتیں صرف کر دیں۔ اُنہوں نے تصورِ خودی کو اس کثرت کے ساتھ اپنے کلام میں استعمال کیا کہ یہ نظریہ اُن کی پہچان بن کر رہ گیا۔ چنانچہ اُن کے تمام فلسفیانہ افکار نظریہ خودی کے گرد ہی گھومتے ہیں۔

خودی کا مفہوم:

خودی کی اصطلاح اُردو ادب میں لفظی و لغوی معنی کے طور پر کئی ایک مفہوم لیے ہوئے ہے۔ مثلاً اَنانیت، خود پرستی، خود مختاری، خودسری، خود رائی، خود غرضی، غرور، نخوت، تکبر وغیرہ۔

کیونکہ یہ لفظ علامہ اقبال سے پہلے بالعموم مندرجہ بالا منفی معنوں میں ہی استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں جب علامہ اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی تو عوام کا تو ذکر ہی کیا اچھے خاصے پڑھے لکھے اصحاب کی ذہنی گرفت میں بھی اس کا وہ خاص مفہوم نہ آسکا جو علامہ اقبال کے ذہن میں تھا۔ چنانچہ اس حوالے سے اُن پر بہت زیادہ تنقید ہوئی۔ حالانکہ علامہ اقبال نے اس لفظ کو خود پرستی، غرور، اور تکبر کی بجائے انسان کی عظمت، حقیقت اور جوہرِ تخلیق کے طور پر استعمال کیا تھا۔

اقبال فلسفۂ خودی اسلامی تعلیمات کے تناظر میں:

اقبال کے فلسفہ خودی کے مفہوم درج بالا کو جب ہم قرآن و حدیث پر پیش کرتے ہیں تو ایک بہت ہی مشہور قول ہے:

''من عرف نفسه فقد عرف ربّه''(۱)

"جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔"

اس کی تسلی بخش بنیادیں ملتی ہیں۔ مثلا: اقبال نے اسی خود شناسی کو ''خودی'' سے تعبیر کیا ہے۔ اُن کے نزدیک عرفانِ ذات، خود آگاہی، ایمان و یقین کی گہرائی، جرات وشجاعت، عزم و استقلال، ذوقِ تسخیر اور کائنات کو مسخر کر کے توحید کا راز آشکار کرنے والی قوت کانام خودی ہے۔ اسرارِ خودی کے دیباچے میں ہے۔

(۱) ملا علی، نورالدین بن سلطان محمد ہروی حنفی، (۱۰۱۴ھ)، مرقاۃ المفاتیح، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ ۱/۲۴۶

"ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کردینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غروراستعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اُردو ادب میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے۔"(۲)

اسی طرح خودی کے مفہوم کے حوالے سے قاضی نزیر احمد کو ۱۲ مئی ۱۹۳۷کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی دونوں کا موضوع یہی مسلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا کہ اگر ان دونوں میں یا کسی (میری) اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجئے گا۔"(۳)

علامہ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں:

"عام معنوں میں اقبال کے ہاں خودی کی اصطلاح سے مراد احساس ذات، شعور نفس، اپنے آپ کی پہچان و حدتِ وجدانی، خودداری یا خود اعتمادی ہے۔ مغربی فلسفے اور نفسیات میں انفرادی افکار ومشاہدات کے تسلسل کو شخصیت کا نام دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظو ں میں ذہن سے گزرتے ہوئے خیالات و مشاہدات کا ہجوم اس کی شناخت کا باعث بنتا ہے۔اس صورتِ حال کو اقبال تسلیم نہیں کرتے کیونکہ ان کے ہاں خودی یاشخصیت کی ایک اپنی حقیقت ہے جس کا انحصار ذہن سے گزرتے ہوئے خیالات و مشاہدات کے ہجوم پر نہیں پس گزرتے ہوئے خیالات و مشاہدات کا ہجو م شخصیت کے وجود کا سبب نہیں بنتا بلکہ "خودی"انہیں وجود میں لاتی ہے۔"(۴)

خودی کی اہمیت اور اس کے اِطلاقات:

علامہ اقبال کے خیال میں انسان کی سب سے عظیم متاع یہی خودی ہے اور خودی کی تکمیل ہی مقصودِ حیات سے ہمکنار کرتی ہے:

---

(۲) محمد اقبال، علامہ، (۱۹۹۶ء)، کلیاتِ اقبال (فارسی)، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان

(۳) نذیر نیازی، سید، (۱۹۵۷ء)، مکتوباتِ اقبال، اقبال اکیڈمی، کراچی، پاکستان۔ ج ۲، ص ۲۳۸-۲۳۹

(۴) جاوید اقبال، ڈاکٹر، (۱۹۹۶ء)، افکارِ اقبال، تشریحات جاوید، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان۔ ص ۴

جس بندہ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار شمشیر کی مانند ہے بُرندہ وبراق(۵)

اقبال حیاتِ ظاہری کو ایک سیپ سے تشبیہ دیتے ہیں اور خودی کو قطرۂ نیساں سے۔ اگر زندگی کی صدف میں قطرہ نیسا ں گوہر بن جائےتو وہ انمول ہے۔ اُس کی قدرو قیمت کا کوئی اندازہ نہیں۔ ورنہ بیکار ہے۔یہی گوہر خودی اصل میں گوہر زندگی ہے۔وہ زندگی جو امر ہوتی ہے:

زندگانی ہے صدف قطرہ نیساں ہے خودی وہ صدف کیا جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
اگر ہو خودنگر و خودگر و خودگیرخودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے(۶)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف
عشقِ بتاں سے ہاتھ اُٹھا، اپنی خودی میں ڈوب جا نقش و نگار دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف
کھول کے کیا بیاں کروں سِر مقامِ مرگ و عشق عشق ہے مرگِ باشرف،مرگ حیاتِ بے شرف(۷)

علامہ اقبال نے خودی کی جو مختلف خصوصیات بیان فرمائی ہیں اُن کی روشنی میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ خودی سے مراد ہے:

خودشناسی! یعنی خود کو جاننا، اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنا، اپنی خوبیوں اور خامیوں سے آگہی، خوبیوں کو چمکانا اور خامیوں پر قابو پانا۔ اپنے مقامِ بلندکو جان لینا۔ اپنے مقصدِ تخلیق کو پہچان لینا اور اُس مقصد کی تکمیل کے ذریعے خالق کا قرب اور خوشنودی حاصل کرنا۔

خود نگری! یعنی اپنی نگرانی کرنا۔ خود کو شرک، بدعت، کمزوری، بزدلی اور اخلاق وکردار کی دیگر تمام خامیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرنا کہ ان میں سے ہر عیب خودی کے لیے زہر ہے۔

خود گری و خود نمائی! یعنی خود کو بنانا، اپنی شخصیت کی تعمیر و ترقی میں کوشاں رہنا، بلندیوں کی طرف بڑھنا، فطرت کی ودیعت کر دہ صفات کو اُجاگر کرنا اور اپنے جوہر ملکوتی کو پہچان کر اُسے چمکانا۔ کیونکہ گوہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

(۵)محمد اقبال، علامہ، (۱۹۹۶ء)، کلیاتِ اقبال، (اُردو)، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان۔ ص۵۸۸

(۶)کلیات اقبال (اردو)، ص۵۴۳

(۷)کلیات اقبال (اردو)، ص۳۷۳

خود گیری! یعنی اپنا احتساب کرنا، ہر وقت اور ہر دور میں، ہر منزل پر سختی سے خود احتسابی کرتے رہنا تاکہ اعمال و کردار پاکیزہ ہوتے چلے جائیں، شخصیت سنورتی اور نکھرتی چلی جائے اور انسان اپنے اُس مقام و مرتبے پر فائزہو سکے جس کے لیے اُسے تخلیق کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال کے فکر میں خودی دراصل انسانی تشخص کی بڑائی ہے جو اس کی اندرونی جذبی کیفیات سے اجاگر ہوتی ہے۔ یہی بڑائی اسے عظیم سے عظیم تر اور پھر عظیم تر سے عظیم ترین بنا دیتی ہے۔ انسان کی شخصیت میں پنہا ں لا تعداد خوبیاں اور صلاحیتیں اسے ہر لحہ متحرک رکھتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ خودی انہیں خوبیوں اور صلاحیتوں کے مجموعہ سے یافت کے مراحل طے کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک عمومی مطالعہ کے مطابق یوں تو ہر شے کی خودی ہے۔ ایک معمولی سے معمولی ذرہ سے لے کر پہاڑ کی بھی شناخت اور اس کی مشمولہ صفات خودی ہے۔ لیکن علامہ اقبا ل کے فکر و فلسفہ میں خودی کا اصل مقام انسانی ذات ہے جو پیدائش سے لے کر موت اور پھر بعد از موت بتدریج آگے بڑھتی جاتی ہے۔ تربیت خودی سے خودی بے حد مضبوط ہو جاتی ہے جس وجہ سے موت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہے۔ وہ خدا کے روبرو بھی اپنا مقام رکھتی ہے اور اس ذات باری تعالیٰ کے شریکِ کار کے طور پر ہمہ وقت اس جہانِ فانی میں برسرِ پیکار رہتی ہے۔

خودی کی تربیت:

خودی اگر زندہ اور تازہ ہے تو پھر کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ زندہ خودی بے حد قوی ہوتی ہے۔ زندہ خودی عظیم جذبہ ہے۔ جرات اور ہمت کانشان ہے۔ خودی دریاؤں اور پہاڑوں جیسی خصوصیت رکھتی ہے:

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایا بخودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر! (۸)

خودی کو توانا اور مستحکم رکھنے، اسے تکمیل تک پہنچانے اور اس سے صحیح طورپر استفادہ کرنے کے لیے اس کی باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہے تاکہ وہ نہ تو کمزور ہو اور نہ ہی اِدھر اُدھر بھٹکنے پائے اور ایک تسلسل کے ساتھ ترقی و ارتقاءکے سفر کو جاری رکھے۔ اب سوال یہ ہے کہ خودی کی تربیت کیسے ممکن ہے۔ کس طرح انسان خودی کو تربیت دے کر بہترین بنایا جا سکتا ہے ؟ وہ کون سے عوامل ہیں جو انسانی خودی کو

(۸) کلیات اقبال (اردو)، ص۵۸۹

تربیت دیں تو وہ مثالی خودی بن جائے۔علامہ اقبال کے نزدیک خودی کو زندہ رکھنے اور اسے مثالی حالت تک لے جانے کے لیے مسلسل جدو جہد کی ضرورت ہے۔اس مقصد کے لیے تخلیق مقاصد کرتے رہنا اور اُن کے حصول کے لیے ہمہ تن کوشاں رہنا ضروری ہے۔ خوب سے خوب تر کی جستجو ہی خودی کو نکھارتی ہے، آرزوؤں ہی کی وجہ سے حرکت پیدا ہوتی ہے اور حرکت ہی کے دم سے حیات قائم و دائم رہتی ہے۔ زندگی کا ثبوت تخلیق مقاصد ہی سے میسر آتا ہے۔ انسان کے اندر مختلف قسم کی صلاحیتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ ان پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے لازم ہے کہ جہدِ مسلسل جاری رکھی جائے۔

خودی کی اخلاقی جدو جہد ہی مقام بندگی ہے۔ یہی مقام انسان کو دیگر مخلوقات سے منفرد کرتا ہے۔ علامہ اقبال خودی کو چھوڑ کر خدا میں ضم ہونا نہیں چاہتے۔ مقام بندگی میں جو لذت یا بڑائی محسوس کرتے ہیں وہ اس کے عوض شان خداوندی حاصل کرنا نہیں چاہتے:

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی(۹)

اسرارِ خودی میں علامہ اقبال نے خودی کی تربیت کے تین مراحل بیان کیے ہیں جن سے گزر کر خودی مضبوط ہوتی ہے اور اس میں استحکام پیدا ہوتا ہے ان مراحل سے گزر کرخودی کندن بن جاتی ہے۔ انسان اپنی حقیقت کی طرف لوٹتا ہے اور وہ انسان کامل بن جاتا ہے:

تری خودی میں اگرانقلاب ہو پیدا عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے(۱۰)

تربیتِ خودی کے اہم مراحل:

یہ دلچسپ بات ہے کہ علامہ نے خودی کی تربیت اور ترقی کے لیے جن عناصر کی نشاندہی کی ہے حکمائے تصوف نے بھی انہی چیزوں کو تزکیہ نفس اور تعمیرِ شخصیت کے لیے ضروری قرار دیاہے۔ دوسرے لفظوں میں اقبال خودی کے نام پر جو صلاحیت پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی تعلیمات بھی معرفتِ نفس سے لیکر معرفتِ خداوندی تک انہی لوازمات پر پہرہ دینے کو ریاضت اور مجاہدہ کا نام دیتی ہیں۔ حیران کن طور پر تصوف کی کتب میں تزکیہ نفس کے لیے بھی ائمہ نے شریعت کی لوازمات کو ضروری قرار دیا ہے اور یہی ''نفس مطمئنہ'' کا درجہ ہے۔تربیتِ خودی کے اہم اور ضروری مراحل درج ذیل ہیں۔

(۹)کلیات اقبال(اردو)،ص۳۵۲

(۱۰)کلیات اقبال(اردو)،ص۶۷۶

ا۔اطاعت:

اطاعت خودی کی تکمیل کا پہلا اور اہم مرحلہ ہے اس سے مراد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ اطاعت سے خودی کو اپنی آزادی کی حدود متعین کرنے کا پتہ چلتا ہے۔ علامہ اقبال کا تصورِ خودی انسان کو مخصوص انداز میں زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

اسلامی ادبیات کی تنقید کے بعد اقبال نے تربیت خودی کے تین مراحل بیان کئے ہیں۔ پہلا مرحلہ اطاعت ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کی خودی، خود سری نہیں ہے۔ حکمرانی کے لیے پہلے، حکم برداری کی مشق مسلم ہے۔ جس نے خود اطاعت کی مشق نہ کہ ہو وہ دوسروں سے اطاعت طلب کرنے کا بھی حق نہیں رکھتا۔ انسان کو خدا اخیار و رزی کی مشق کرانا چاہتاہے۔ تاکہ وہ فطرت کے جبر سے نکل کر اپنے اختیار سے فضیلت کوش اور خدا طلب بن سکے۔ اصل مقصد اطاعت کو اختیاری بنانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ جبر کو اختیار میں بدلنا ہے۔ ایک عارف کا قول ہے کہ ہمیں اختیار اس لیے عطا کیا گیا ہے کہ ہم اپنے اختیار دکو خد کے اختیار سے ہم کنار کر کے جبر و اختیار کا تضاد محو کر دیں۔ فرمان پذیری کسی غیر کی نہیں بلکہ اپنی فطرت کے نصب العین کی ہے۔اسی مضمون کو اقبال نے اس شعر میں ادا کیا ہے:

در اطاعت کوش اے غفلت شعار می شود از جبر پیدا اختیار(۱۱)

جب انسان اپنے اختیار سے اپنی سیرت کو مستحکم کر چکتا ہے تو وہ ایک منظم آئین کے ماتحت عمل کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس میں ایک اختیاری جبر پیدا ہو جاتا ہے۔ باقی تمام کائنات بھی آئین پر قائم ہے۔ لیکن اس میں آئین سے سرگردانی کی کوئی طاقت یا میلان نہیں"(۱۲)

خدا کی حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ کو برضا و رغبت تسلیم کر لینا اطاعتِ خداوندی ہے۔ اپنی زندگی کو نظام خدا کے قوانین و ہدایات کے مطابق ڈھالنااطاعت کا لازمی حصہ ہے۔ خدائی ہدایات اور آئین کے تحت زندگی بسر کرنا اور تمام تر معاملاتِ زیست انہی بنیادوں پر استوار کرنا اپنی انا اور خودی کی صحیح تربیت کرنے کی ابتدا ہے۔اس طرح انفرادی زندگی کی تربیت سے پورا معاشرہ اطاعت کی زندگی گزار تا ہے۔ یہی خودی کی مثبت تربیت کا پہلا مرحلہ ہے۔ اگر ابتدا ایسے مثبت ہو گی تو پھر اگلے مرحلہ میں داخل ہونے کے ہم اہل

(۱۱)کلیات اقبال، ص ۶۳

(۱۲)عبدالحکیم، خلیفہ، فکر اقبال، (۱۹۶۱ء)، بزم اقبال، لاہور، پاکستان۔ ص ۱۷۴

ہو سکیں گے۔آئین خداوندی کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ انفرادیت کے ساتھ ساتھ پورا معاشرہ اطاعتِ خدا وندی کرتے ہوئے خدا کی حاکمیت کو تسلیم کرے جس سے مسرت اور تسکینِ قلب حاصل ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کے تربیتِ نفس کے اس پہلے اصول میں اطاعت شعاری اور صبر و استقلال سے خیرِ برتر کو حاصل کیا جا سکتا ہے کیونکہ اعلیٰ اور حقیقی آزادی صرف اطاعت گذرای سے ممکن ہو سکتی ہے۔ اطاعتِ خدا وندی سے کمزور سے کمزور خودی بھی آہستہ آہستہ مستحکم ہونا شروع ہو جاتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ مستقل مزاجی سے خودی میں فضیلت و برتری کا عنصر غالب آجاتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ خداوندی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾(۱۳)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو تم اللہ کی اور اطاعت کرو تم رسول کی اور تم میں سے جو صاحب امر ہے۔"

تربیتِ خودی میں اطاعت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر اطاعت نہ ہو تو کوئی فرد کسی بھی نوعیت اور حالت میں آگے ترقی نہیں کرسکتاہے۔ علامہ اقبال نے اطاعت اور فرمانبرداری کو اہم بنیادی مرحلہ قراردیا ہے۔وہ اطاعت کی وضاحت کے لیے اونٹ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کا کہنا ہے کہ:

"اونٹ ایک ایسا جانور ہے جو اپنی طبع میں مطیع، فرمانبردار اور محنت شعار ہوتا ہے۔ شتربان اسے جدھر چلاتا ہے بے چون و چرا، صبر و استقلال کے ساتھ اطاعت کرتا ہے۔ انسان کو بھی چاہیئے کہ اونٹ ہی کے اس انداز سے سبق سیکھے اور خدا،اس کے رسول ﷺ اور احکام الٰہی کی اطاعت کرے اس لئے کہ اطاعت، فرمابنرداری اور فرماں پزیری ہی سے وہ کمال کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو خدا کے تابع کر لے تو ساری کائنات اس کے تابع فرمان ہو جاتی ہے۔"(۱۴)

اطاعت حقیقت میں عبودیت ہے جو عبادت کی اصل بنیاد ہے یعنی انسان ایک ایسی مطلق ہستی کی اطاعت کرتا ہے جس نے انسان کو ایک وجود کے ساتھ بے شمار خوبیاں عطا کی ہیں۔

---

(۱۳)سورۃ النساء،۵۹:۴

(۱۴)کلیاتِ اقبال(فارسی)،ص ۶۴

۲۔ضبط نفس:

جب انسان اطاعت میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو پھر دوسرا مرحلہ ضبط نفس کا آتا ہے جس میں انسان کو اپنی طبیعت، مزاج، عادات اور جذبات پر قابو حاصل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے مرحلے میں جن چیزوں پر مجبورانہ عمل کرنا ہوتا ہے دوسرے مرحلے میں وہ چیزیں طبیعت اور مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں اور اُن پر عمل پیرا ہوناآسان ہو جاتا ہے۔ضبط نفس کے حصول کے لیے اقبال ارکانِ اسلام کی پابندی سے مثبت نتائج حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں ان رکانِ خمسہ کی پابندی کو لازمی قراردے کر ان کے مقاصد اور فوائد بیان کرتے ہیں۔ یہ ارکان اسلام ہیں۔ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ یہ ارکان بنیادی طور پر وہ وسائل ہیں جن سے ضبطِ نفس پیدا ہوتاہے۔

ضبط نفس کے مرحلہ کو پورا کرنے کے لیے ارکانِ اسلام پر ایمان لانا اور عمل کرنا ضروری ہے۔توحید پر جب تک کوئی انسان ایمان نہ لائے اس وقت تک اس کا نفس غیر اللہ کے وسوسوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ کلمہ توحید پر ایمان لانے والا صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق و مالک سمجھتا ہے۔ اسی طرح نماز سے بھی نفس کو تقویت ملتی ہے اور یہ برائی سے بچاتی ہے:

﴿إِنَّ الصَّلاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾(۱۵)

"بے شک نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔"

نفس امّارہ ہمیشہ برے کاموں کی ترغیب دیتا ہے لیکن نماز اسے برائیوں سے باز رکھتی ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ نماز میں خشوع و خضوع کو برقرار رکھا جائے۔

روزہ در اصل اللہ کے حکم سے کھانے پینے اور دنیوی خواہشات سے رُک جانے کانام ہے۔ گویا روزہ ایک مسلسل مجاہدہ ہے۔روزہ رکھنے سے قوتِ برداشت میں بے حد اضافہ ہوتا ہے۔ بھوک اور پیاس ہی انسان کو صبر اور سہہ لینے کی طاقت مہیا کرتی ہے۔ قوتِ ارادی میں بھی اضافہ ہوتا ہے کیونکہ روزہ دار اپنی مرضی اور ارادے سے روزے رکھتا ہے۔کھانے پینے اور دنیاوی خواہشات سے مکمل اجتناب برتتا ہے۔

زکوٰۃ بھی نفس کی خصوصی تربیت کرتی ہے۔ مال و دولت سے نفسانی خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ زکوٰۃ ان خواہشات کو کنٹرول کرنے میں مدد دیتی ہے۔ارشادِ خداوندی ہے:

---

(۱۵)سورۃ العنکبوت،۲۹:۴۵

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾(١٦)

"تم ہر گز نیکی کے مستحق نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم اس چیز کو خرچ نہ کرو جس کو تم محبوب رکھتے ہو۔"

زکوٰۃ سے اخوت و مساوات کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے اور مال میں برکت بھی آتی ہے۔ حج کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ایسی جامع صفات عبادت ہے جس میں جملہ عبادات کی تاثیر رکھی گئی ہے۔ خصوصاًخالق کی محبت میں وطن گھر، خاندان حتیٰ کے لباس بھی ترک کر دینے سے اللہ کی محبت میں فریفتہ ہو کر ا سکی تسبیحات کرنے سے انسان عشق کی منزل پالینے کے قریب ہو جاتا ہے۔ حج کرنے کے بعد حجاجِ کرام پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ ایمان اور تقویٰ کی پاکیزگی لے کر لوٹتے ہیں جس سے اُن کے ماحول کی اصلاح ہوتی ہے۔

۳۔ نیابتِ الٰہی:

خودی کی تربیت کا تیسرا اور آخری مرحلہ علامہ اقبال کی نظر میں نیابتِ الٰہی کا تصور ہے۔ یہ ایک اعلی درجے کا احساسِ ذمہ داری ہے اس مرحلہ میں داخل ہونے کے بعد انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہو جاتا ہے اور ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾(١٧) (بے شک میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں) کی صداقت کا صحیح معنی میں احساس کر سکتا ہے جو شخص نائب الٰہی اور خلیفہ اللہ فی الارض ہونے کا مستحق ٹھہرتا ہے وہی انسان کامل ہے۔ انسانِ کامل کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ انسان کے روحانی ارتقا کا خلاصہ ہے۔ خودی اپنی انتہا تک پہنچنے کے لئے بے حد تگ و دو کرتی ہے پھر جا کر ایک انسانِ کامل پیدا ہوتا اہے۔اقبال فرماتے ہیں:

عمر ھا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات   تاز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں(١٨)

اس دانائے راز کا ظہور حقیقت حضرت محمد ﷺ کی صورت میں ہمارے رہنما کی حیثیت سے موجود ہے۔علامہ اقبال نے پروفیسر نکلسن کو ایک خط میں لکھا:

---

(١٦)سورۃ آلِ عمران،۳:۹۲

(١٧)سورۃ البقرہ،۲:۳۱

(١٨)کلیاتِ اقبال(فارسی)،ص۷۳

"انسانِ کامل کے بغیر دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ لیگیں، پنچائتیں اس مقصد کے لئے قطعی ناکافی ہیں۔ آئے دن اس قسم کی لیگیں اور پنچائیتیں برابر ناکام ثابت ہو رہی ہیں۔"(۱۹)

قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(۲۰)

"بے شک تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں بہتریں نمونہ ہے۔"

انسان آنحضرت ﷺ کی ذاتِ بابرکت کو نمونہ قرار دے کر انسانِ کامل بننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ انسان نائب الٰہی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اقبال کے افکار کی روشنی میں انسان کامل ہی دنیا میں خدا کا حقیقی نائب اور انسانیت کا صحیح علمبر دار اور حقیقی حکمران ہے۔ وہ جس ہمت و کاوش سے خدا کے قریب جاتا ہے خدا اتنا ہی اس کو اپنے قریب تر کر لیتا ہے۔ اس عمل سے انسان درجہ کمال تک پہنچنے کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ سب کچھ انسان کے اعمال پر منحصر ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کر کے انسانِ کامل بن سکتا ہے۔ انسانِ کامل دراصل کامل ترین خودی ہے۔انسانیت کے ارتقائی مدارج میں جس قدر مشکلیں اور صعوبتیں پیش آئیں، وہ صرف اسی نصب العین کے حصول کی خاطر گوارا ہو سکتی ہیں۔ انسان ِ کامل وجود انسان کی جسمانی اور روحانی معراج کا کمال ہو گا۔ اس میں زندگی کی متضاد قوتیں ہم آہنگ ہو جائیں گی، اور اس کے اندر قوت اور علم اپنے انتہائی مدارج کے ساتھ موجود ہوگا اور وہ انسانِ کامل تمام کائنات پر حاوی ہو گا۔علامہ اقبال فرماتے ہیں:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق! (۲۱)

انسانِ کامل کی ہمہ گیر فطرت کے متعلق اقبال نے "مردِ مسلمان" کے عنوان سے ضرب کلیم میں ایک پرزور نظم لکھی ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہو ں تو بنتا ہے مسلمان

(۱۹)مضامین اقبال، ص٦٦

(۲۰)سورۃ الاحزاب،۳۳: ۲۱

(۲۱)کلیات اقبال(اردو)، ص۵۵۷

ہمسایہ جبریل امیں بندۂ خاکی ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز آہنگ میں یکتا صفتِ سورہ رحمٰن(۲۲)

ضعف و استحکامِ خودی کا معیار:

علامہ اقبال نے خودی کی صرف فلسفیانہ تشریح پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ اعلیٰ اقدار بھی بیان کی ہیں جن کو ملحوظِ خاطر رکھ کر انسان خودی کی منازل کو طے کر سکتا ہے۔ ان اقدار کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

خودی کی ایجابی وسلبی اقدار:

وہ اقدار جن پر عمل کرنے سے خودی مستحکم ہوتی ہے۔ لہٰذا خودی کی تکمیل کے لیے اُنہیں اپنانا ضروری ہے۔اسی طرح وہ اقدارجو خودی کے ضعف کا باعث بنتی ہیں۔ لہٰذا خودی کی حفاظت کے لیے ان اقدار سے بچنا ضروری ہے۔علامہ اقبال کے کلام میں جا بجا ان ایجابی و سلبی اقدار کی نشاندہی کی گئی ہے مگریاد رہے کہ اقبال کے ہاں ان اقدار کا معیار اور پیمانہ عام صوفیاءسے تھوڑا مختلف ہے۔ دونوں اقسام کی تین تین اہم اقدار کاذیل میں اختصار سے ذکر کیا جارہا ہے۔

خودی کی ایجابی اقدار:

۱-عشق:

استحکام خودی کے لیے جن اخلاقی اقدار کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے علامہ اقبال کے نزدیک ان میں عشق بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔اقبال کا تصورِ عشق روایتی تصور سے ہٹ کر ہے۔ اس ضمن میں اقبال مولا نا رومی کے ہمنوانظر آتے ہیں۔ جنہوں نے فرمایا تھا:

شادباش اے عشقِ خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علت ہائے ما(۲۳)

(۲۲)کلیات اقبال(اردو)،ص ۵۷۳

(۲۳)مثنوی مولانا روم، دفتر اول، ص ۳۳

روایتی عشق محبوب میں اپنے آپ کو مُستغرق کر دینا سکھاتا ہے۔ جبکہ علامہ اقبال کے خیال میں محبوب کو اپنی ذات میں جذب کر لینے کا نام عشق ہے عشق ہی وہ مرحلہ ہے جو خودی کو استحکام بخشتا ہے۔انہوں نے عشق و محبت دونوں کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔ بال جبریل میں ان کا شعر ہے:

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق   سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں(۲۴)

اسی طرح عشق و محبت سے خودی کو مستحکم کرنے کے بارے میں اپنی مثنوی " اسرار و رموز" میں علامہ اقبال فرماتے ہیں:

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است   زیرِ خاکِ ما شرار زندگی است

از محبت می شود پائندہ تر   زندہ تر،سوزندہ تر تابندہ(۲۵)

علامہ اقبال کے ہاں عشق و محبت سے مراد اللہ تعالیٰ کی محبت ہے جو مومن کا کُل سرمایہ ہوتا ہے۔یہ سرمایہ عشقِ الہٰی رسول اللہ کی اطاعت اور محبت سے ہی ممکن ہے۔ قرآن مجید میں یہ ارشاد خدا وندی بڑا جامع اور واضح ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾(۲۶)

"ان سے کہہ دو، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو، تو میری متابعت کرو، اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا"

اسی طرح حدیث مبارکہ میں محبت، رسول ﷺ کی لوازمت اور ناگزیریت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ''(۲۷)

"تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اس کے بچوں اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

---

(۲۴)کلیات اقبال(اردو)،ص ۳۷۲

(۲۵)کلیاتِ اقبال(فارسی)،ص۱۸

(۲۶)سورۃ آلِ عمران،۳:۳۱

(۲۷)بخاری،ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل،(۱۹۸۷ء)،الصحیح،دار ابن کثیر،یمامہ،بیروت۔۱/۱۴،رقم: ۱۳

حقیقت یہ ہے کہ اس جذبہ عشق کے بغیر مومن نہ تو معرفت حق حاصل کر سکتا ہے اور نہ اس کی رضا کا حقدار بن سکتا ہے جو تمام عبادات کا مقصود و مدعا ہے۔ علاوہ ازیں عشق بندہ مومن کو غیر معمولی جرات و ہمت بھی عطا کرتا ہے۔یہ عشق ہی ہے جس کی بدولت انسان خطرات میں کو د پڑتا ہے اور بڑے بڑے معرکے سرانجام دیتا ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی(۲۸)

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق(۲۹)

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافرو زندیق(۳۰)

علامہ اقبال کے کلام میں جگہ جگہ عشق کی ضرورت و اہمیت بیان کی گئی ہے۔ جنگِ بدر ہو یا اُحدو احزاب اور حنین کا معرکہ ہو سب عشق سے سر ہوئے۔ علامہ اقبال کے خیال میں اسلام کی تکمیل کا انحصار بھی عشق پر ہے۔ بالِ جبریل کے درج بالا شعرسے علامہ اقبال کا نقطہٗ نظرواضح ہو تا ہے کہ کافر اگر صاحبِ عشق ہے تو اس کا کفر بھی اسلام کا درجہ رکھتا ہے۔دوسری طرف اگر مسلمان عشق کا صحیح صحیح جذبہ دل میں نہیں رکھتا تو اس کا اسلام بھی کفر کے برابر ہے۔ خودی کے استحکام کا انحصار عشق پر ہے اور عشق کا ماخذ قرآن مجید اور حدیث شریف ہے لیکن قرآن وحدیث میں اس عشق کو "شدید محبت" سے معنون کیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾(۳۱)

"ایمان والے اللہ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔"

۲ - فقرو استغناء:

اقبال کے تصورِ خودی کا دوسرا رکن فقر ہے۔ فقر طریقت کی ایک اصطلاح ہے جسے اقبال نے قطعی الگ معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اقبال کی فکر میں فقر بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ جس کے ڈانڈے عشق سے

(۲۸)کلیات اقبال(اردو)ص، ۳۱۰

(۲۹)کلیات اقبال(اردو)،ص۴۳۹

(۳۰)کلیات اقبال(اردو)،ص۳۷۰

(۳۱)سورۃ البقرہ۲:۱۶۵

جا ملتے ہیں اور جہاں عشق اور خودی کے تصورات باہم شیر و شکر نظر آتے ہیں۔ انسانی خودی کی تکمیل تب ہوتی ہے جب اُس میں شانِ فقر پیدا ہو جائے۔ گویا کہ تکمیلِ خودی اور فقر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں:

محرم خودی سے جس دم ہوا فقر تو بھی شہنشاہ، میں بھی شہنشاہ(۳۲)

فقر کو عام طور پر بے کسی، مسکینی، مجبوری اور رہبانیت کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اقبال فقرو استغناءسے وہ بے نیازی مراد لیتے ہیں جسے مادی وسائل کی موجودگی اور غیر موجودگی کا خیال تک نہ ہو۔ اگر یہ وسائل میسر ہوں تو انسان ان میں منہمک نہ ہو جائے اور اگر نہ ہوں تو ان کے حصول کے لیے بے چین اور مضطرب نہ ہو۔ وہ ان سے بے نیاز ہو نہ کہ ان کے متعلق فکر مند اقبال کا یہ فقرایسا فقر ہے جو مادی وسائل کو حاصل کرنے یا اُن کی حفاظت کے لیے اعلیٰ قدروں کو قربان نہیں کرتا۔ اُس کی نگاہ میں شانِ سکندری بھی ہیچ ہے۔ بالفاظ دیگر دل کو حرص و ہوس سے پاک کر کے تھوڑے پر قناعت کر لینے، غیر اللہ سے بے نیاز ہو جانے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا نام اقبال کے ہاں فقر ہے۔

علامہ اقبال کے خیال میں فقر ذہن کی ایسی کیفیت کا نام ہے جس کے مطابق انسان کسی اعلیٰ نصب العین کے لیے کوشاں رہتا ہے لیکن اُس کے لیے کسی معاوضہ کا طلب گار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو دنیوی حرِص و لالچ اور مادی سامانوں سے بہت اُوپر اُٹھا لیتا ہے۔ اس کے نیتجے میں شخصیت کوجو بلندی نصیب ہوتی ہے اُس کا نقشہ ان اشعار میں کھینچا گیا ہے:

اک فقر سکھاتا ہے صیّاد کو نخچیری اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری(۳۳)

اس طرح ان صفات کے حامل شخص یعنی فقیر کا ایک مخصوص مزاج بن جاتا ہے۔ وہ سکون و آرام کاطالب نہیں ہو تا بلکہ تبدیلی و تحرک کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اندھیروں سے لطف اُٹھاتا ہے اور طوفانی موجوں سے کھیلنا پسند کرتا ہے تاکہ روح و بدن کی بالیدگی اور نشوونما کا سلسلہ جاری رہے اور خودی اپنے کمال کو پہنچ جائے۔ اقبال کے ہاں یہ شانِ فقر اُس کی ترقی، سربلندی اور اقوام عالم کے مقابلے میں باعزت مقام کی ضمانت ہے:

---

(۳۲)کلیات اقبال(اردو)، ص۶۷۷

(۳۳)کلیات اقبال(اردو)، ص۴۹۰

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
پسند روح وبدن کی ہے وانمود اس کو کہ ہے نہایتِ مومن خودی کی عریانی
یہ فقر مرد مسلماں نے کھو دیا جب سے رہی نہ دولت سلمانی وسُلیمانی(۳۴)

۳ - جرأت و ہمت:

تکمیل خودی کے لیے اقبال جرات رِندانہ اور ہمت مردانہ کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ پیامِ مشرق، ہند باجچہ خویش اور شاہین و ماہی میں جرات اور ہمت کی نہایت اعلیٰ تعلیم دی گئی ہے۔ ہمت اور جرات سے ایک طرف سنگ گراں ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے:

سنگِ رہ آب است اگر ہمت قوی است (۳۵)

راستے کی تمام منزلیں جتنی بھی مشکل کیوں نہ ہوں وہ جرات و ہمت سے ہی عبور ہو سکتی ہیں۔ ایسے باہمت مومن کو اقبال نے شاہین کا عنوان دیا ہے جو بلند پروازی اور بے نیازی میں دیگر پرندوں سے ممتاز ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانو ں میں(۳۶)

اور دوسری طرف آبجو سے بحر بیکراں پیدا ہو سکتے ہیں:

خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے اس آبجو سے کیے بحر بیکراں پیدا(۳۷)

اور پھر اس سے آگے بڑھ کر ہمت مردانہ کے سامنے تو آسماں کی بھی کوئی حقیقت نہیں:

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں!
بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں زیر پر آگیا تو یہی آسماں زمیں! (۳۸)

اور ایک جگہ اس سے بھی آگے جا کر لکھتے ہیں:

در دشتِ جنوں من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ(۳۹)

---

(۳۴)کلیات اقبال(اردو)،ص ۵۶۳

(۳۵)کلیات اقبال(اردو)،ص ۵۳

(۳۶)کلیات اقبال(اردو)،ص ۴۴۸

(۳۷)کلیات اقبال(اردو)،ص ۶۱۳

(۳۸)کلیات اقبال(اردو)،ص ۶۸۹

اقبال شبِ معراج سے بھی انسان کو یہی پیام دیتا ہے:

رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرش بریں کہہ رہی ہے یہ مسلماں سے معراج کی رات(۴۰)

عشق جیسی اعلیٰ اور ارفع قدر بھی بغیر ہمت کے روباہی ہے:

بے جرأت رندانہ ہر عشق ہے روباہی بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰھی! (۴۱)

اقبال کے خیال میں جرات اور ہمت زندگی کے ہر شعبہ میں ضروری ہے کہ اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں:

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں کچھ کام نہیں بنتا بے جرات رندانہ ! (۴۲)

اقبال جرات و ہمت کو محدود معنوں میں استعمال نہیں کرتے۔ اُن کے ہاں اس کے معنی کافی وسیع ہیں جس میں اخلاقی اور ایمانی جرات بھی شامل ہے:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی (۴۳)

علاوہ ازیں اقبال کے نزدیک رواداری، قوت و طاقت، یقین، جفا کشی، صبر و استقلال، حریت، مساوات، اخوت اور وحدتِ مقاصد وغیرہ بھی استحکام خودی میں ایجابی اقدار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

خودی کی سلبی اقدار:

جس طرح خودی کے استحکام کے لیے بعض صفات کو اپنانا ضروری ہے اسی طرح خودی کو ضعف سے بچانے کے لیے بعض امور سے پرہیز ضروری ہے۔اُن میں سے تین بہت نمایاں یہ ہیں۔

ا - سوال اور طلب:

اقبال کے تصورِ خودی میں غیرتِ ایمانی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ خودی کو عزت ایمانی کا مترادف کہا جائے تو بے جا نہیں ہو گا۔ یہ عزت استغنی اور توکل سکھاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے ہاں "سوال کرنا" یا کسی سے کچھ "مانگنا" ایک ایسا عمل ہے جس سے خودی کمزور ہو جاتی ہے۔ سوال کرنے والا

---

(۳۹) کلیات اقبال، ص ۱۶۶

(۴۰) کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۷۸

(۴۱) کلیات اقبال (اردو)، ص ۶۸۶

(۴۲) کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۹۴

(۴۳) کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۸۶

اپنے آپ کو کمتر ظاہر کرتا ہے اور جس سے مانگتا ہے اس کو اعلیٰ و برتر گردانتا ہے جس کی وجہ سے انسانی خودی طاقتور ہونے کے بجائے کمزور ہو جاتی ہے۔اقبال کے عقیدے میں "سوال" انسان کی وہ مذموم عادت ہے جس کی وجہ سے وہ خودداری، شرافت اور عزت نفس جیسی گراں مایہ چیزوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ غربت کی وجہ سے اگر کوئی شخص ذلیل ہو گیا ہے تو "سوال" سے وہ ذلیل تراور اگر نادار ہے تو نادار تر ہو جاتا ہے۔ "سوال" سے خودی کے اجز ا متفرق، اس کی قوت زائل اور اس کا مرتبہ کم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

از سوال آشفتہ اجزائے خودی　　بے تجلی نخل سینائے خودی
از سوال افلاس گردد خوار تر　　از گدائی گدیہ گر نادار تر (۴۴)

اقبال کے نظامِ فکر میں ایجابی اقدار میں جو عظمت عشق کو حاصل ہے سلبی اقدار میں سوال کا درجہ اُتنا ہی پست ہے۔عشق انسان کو عملی زندگی کی ترغیب دیتا ہے اور عمل سے خودی مستحکم ہوتی ہے جبکہ سوال کرنے سے انسان بے عملی اور تن آسانی کا شکار ہو جاتا ہے جس سے خودی ضعیف اور کمزور ہو تی ہے۔ عشق مجسم خیر ہے جبکہ سوال مجسم شر ہے۔ کسی کے سامنے دست دراز کرنے سے خودی اور عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔ جس عمل سے خودی میں ضعف پیدا ہو اس عمل سے دوری اختیار کرنی چاہئے حتیٰ کہ خودی کو کمزور کرنے کے بجائے خودی کا خاتمہ یعنی موت زیادہ بہتر ہے:

اے طائرِلا ہوتی اُس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی (۴۵)

علامہ اقبال نے سوال کے لفظ کا مفہوم دینی اقدار اور روح دین کے پیشِ نظر بہت وسیع معنی میں استعمال کیا ہے۔ہر وہ چیز ان کے نزدیک سوال میں داخل ہے جوذاتی کوشش اور شخصی جدو جہد کے بغیر حاصل ہو۔ جو محنت و مشقت سے پھل ملتا ہے وہ یقینا اطمینانِ قلب کا باعث بنتا ہے۔ جس شخص کو بغیر محنت کئے ہوئے مال و دولت ورثے میں ملے وہ بھکاری ہے کہ اس نے اس کے حصول کے لئے کسی قسم کی محنت نہیں کی۔اسلام نے تو اس رزق کو حلال ہی نہیں سمجھا بلکہ اسے سود سے تشبیہ دی ہے۔اس نے دینی قیادت ہو یا سیاسی قیادت دونوں کو عوام سے عطیات لیکر زندگی گزارنے کو بہت سختی سے رد کیاہے۔اقبال نے بالِ جبریل میں ایک پوری نظم لکھی ہے جس میں ایسی نذر و نیاز اور عطیات کی مذمت کی گئی ہے ایسے لوگ جو

---

(۴۴)کلیاتِ اقبال(فارسی)،ص ۲۳

(۴۵)کلیات اقبال(اردو)،ص ۳۸۵

خود کو دینی رہنما اور پیشوا سمجھتے ہیں اور ان کا ذریعہ روز گار مریدوں اور عقیدت مندوں کے عطیات ھیں اقبال نے انہیں برھمن اور مہاجن قرار دیا ہے جو سود خوری سے گزر اوقات کرتے ہیں۔"باغی مرید" کے عنوان سے لکھی جانے والی نظم میں کہتے ہیں:

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دیہاتی ہو مسلماں ہے سادہ مانندِ بُتاں پیجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں ! سود ہے پیرانِ حرم کا ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ اِرشاد زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن(۴۶)

اسی طرح اپنی رعایا سے خراج وصول کرنے والا بادشاہ بھی گدا ہے کہ وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے عوام سے مانگتا ہے:

مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج کوئی مانے یانہ مانے، میر و سلطاں سب گدا (۴۷)

علامہ اقبال نے اس شخص کو بھی مانگنے والا قرار دیا ہے جو دوسروں کے خیالات سامنے رکھ کر سوچتا ہے اپنی رائے یا نقطۂ نظر نہیں رکھتا کیونکہ اس نے خیالات مانگے ہیں خود اپنا ذہن استعمال کر کے نہیں سوچا:

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی! کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی؟ (۴۸)

خدا کی ایک صفت بے نیازی ہے انسان بھی اگر اپنے اندر شانِ بے نیازی پیدا کرے تو وہ مانگنے یعنی سوال کرنے کی ذلت سے بچ سکتا ہے۔ بے نیازی میں انسان کی خوداری، شرافت اور عزتِ نفس پنہاں ہے۔علامہ اقبال نے حضرت عمر کا اُونٹ کی پشت سے خود اُتر کر تازیانہ اُٹھانے والا مشہور واقعہ بیان کرتے ہوئے سوال کی ذلت سے بچنے کی تلقین کی ہے۔

خود فرود آ از شتر مثل عمر الحذر از منت غیر الحذر (۴۹)

---

(۴۶)کلیات اقبال(اردو)ص،۴۹۶

(۴۷)کلیات اقبال(اردو)،ص۴۴۴

(۴۸)کلیات اقبال(اردو)،ص۶۳۴

(۴۹)کلیاتِ اقبال(فارسی)،ص۲۳

۲ - جامد تقلید:

خودی کی تکمیل کی راہ میں اقبال تقلید کی روش کو بھی بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے بارہا اپنے اشعار اور لیکچرز میں تقلید کے تباہ کن اثرات سے متنبہ کیا ہے اور اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اقبال کے خیال میں جامد تقلید بہت سی اعلیٰ صفات کو ختم کر دیتی ہے۔ وہ فکر و عمل کے لیے سم قاتل ہے:

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جراتِ اندیشہ کہاں آہ!محکومی و تقلید و زوال تحقیق(۵۰)
نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور(۵۱)

یہی نہیں بلکہ تقلید فکر و عمل کے علاوہ تخیل کو بھی ختم کر دیتی ہے:

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل ہندی بھی فرنگی کا مقلد، عجمی بھی
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرور ازلی بھی! (۵۲)

فکرو عمل اور تخیل تو رہے ایک طرف،اقبال کے خیال میں تقلید موت سے بھی بدتر ہے:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
مانندِ خامہ تیری زباں پر ہے حرفِ غیر بیگانہ شے پہ نازشِ بے جا بھی چھوڑ دے (۵۳)

علاوہ ازیں تقلید قلب و نظر کی رنجوری بھی ہے:

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اِس سے بری ہے نہ مغرب اُس سے بری جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری(۵۴)

تقلید تلاشِ حق کی راہ میں ایک ایسا سنگِ گراں ہے کہ جب تک اسے راستہ سے ہٹایا نہ جائے حقیقت تک رسائی ممکن نہیں:

---

(۵۰)کلیات اقبال (اردو)،ص ۵۳۴

(۵۱)کلیات اقبال (اردو)،ص ۵۸۳

(۵۲)کلیات اقبال (اردو)،ص ۶۳۵

(۵۳)کلیات اقبال (اردو)،ص ۱۳۳

(۵۴)کلیات اقبال (اردو)،ص ۶۷۲

چاک کن پیراہن تقلید را   تابیا موزی از و توحید را (۵۵)

تاہم ایک مقام ایسا ہے جہاں اقبال نہ صرف تقلید کی اجازت دیتے ہیں بلکہ اسے ضروری سمجھتے ہیں اور یہ وہ موقع ہے جب کوئی قوم زوال اور انحطاط کا شکار ہو چکی ہو تو اُس زمانے میں قوم کے عام افرد کی ذہنی صلاحتیں ماؤف ہو جاتی ہیں اور وہ اُس سطح پر آجاتے ہیں کہ اپنا بُرا بھلا سوچنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں۔ ہر چمکدار چیز کو سونا سمجھ کر اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ہر ایک سے مرعوب ہو جاتے ہیں اپنی ہر چیز کو بدتر اور دوسروں کی ہر بات کو بہتر سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ آزادی فکر و عمل کو محدود کر دیا جائے۔ وگرنہ اُس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو گا:

آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی   رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار   انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ (۵۶)

۳ - یاس، حزن اور خوف:

ان تینوں کا تعلق منفی سوچ کے ساتھ ہے۔ "یاس" مایوسی اور نا اُمیدی کی کیفیت کو کہتے ہیں۔ "حزن"کسی نقصان یا ناخوشگوار واقعہ کے پیش آنے پر ذہن کے افسردہ اور غمزدہ ہونے کی حالت کا نام ہے جب کہ مستقبل میں پیش آنے والے کسی حقیقی یا فرضی حادثے کے متعلق سوچ کر ذہن میں پیدا ہونے والے ڈر اور پریشانی کے خیالات کوخوف کہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک یہ تینوں اُم الخبائث اور قاطع حیات ہیں اور جو بھی سلبی اقدار قاطع حیات اور زندگی کی دشمن ہو ں گی وہ یقینا خودی کی منزل تک پہنچنے میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوں گی۔

جہاں تک مایوسی و نااُمیدی کا تعلق ہے تو قرآن و حدیث میں بھی اس کی سختی سے ممانعت آئی ہے اور اقبال بھی اس سے سختی سے منع کرتے ہیں۔ اقبال کا پیغام اور اُن کی شاعری تمام تر اُمید ہی اُمید ہے۔ نہ وہ خود مایوس ہوتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو مایوس ہونے دیتے ہیں:

نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشتِ وِیراں سے   ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی! (۵۷)
نومیدنہ ہوان سے اے راہبر فرزانہ   کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی(۵۸)

---

(۵۵)کلیات اقبال(اردو)،ص۱۳۳

(۵۶)کلیات اقبال(اردو)،ص۵۸۹

(۵۷)کلیات اقبال(اردو)،ص۳۵۱

حزن و ملال بھی اقبال کی نگاہ میں یاس سے کم نہیں۔جہدِ مسلسل، جرات رندانہ، بے باکی، مصائب کا بڑھ کر مقابلہ کرنے اور کامیابی کا خیال کیے بغیر ادائیگی فرض میں منہمک رہنے کی تعلیم دینے والا اقبال حزن و ملال اور رنج سے جس قدر بھی متنفر ہو کم ہے۔چنانچہ حزن کے متعلق کہتے ہیں:

خفتہ با غم درتہ یک چادر است غم رگِ جان را مثالِ نشتراست
اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر از نبی تعلیم لا تحزن بگیر(۵۹)

یاس اور حزن سے بھی زیادہ اقبال جس چیز کو قاطع حیات سمجھتے ہیں وہ خوف ہے۔ خوفِ خدا کے سوا وہ ہر قسم کے خوف کو شرک سمجھتے ہیں:

ہر کہ رمز مصطفی فہمیدہ است شرک را در خوف مضمر دیدہ است(۶۰)

اور خوفِ غیر میں اقبال ہر قسم کے خوف کو شامل کرتے ہیں:

خوف عقبیٰ خوف دنیا خوف جاں خوف آلامِ زمین و آسماں(۶۱)

اقبال کے نزدیک ان تمام امراضِ خبیثہ کا اصل علاج توحید میں رسوخ ہے:

تا عصائے لا الہ داری بدست ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چوں جاں اندرتنش خم نگردد پیش باطل گردنش
خوف را درسینہ او راہ نیست خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست(۶۲)

رموزِ بیخودی میں اقبال نے"درمعنی ایں کہ یاس و حزن و خوف اُم الخبائث است و قاطع حیات وتوحید ازالہ ایں امراض خبیثہ فی کند"میں اس مسلہ کو نہایت دل نشین انداز میں پیش کیا ہے۔

علاوہ ازیں اقبال کے نزدیک عجمی تصوف، ملاّئیت، حبّ غیر اللہ، وطنیت، ملوکیت اور آمریت وغیرہ جیسی سلبی اقدار بھی خودی کے ضعف کا باعث بنتی ہیں۔

---

(۵۸)کلیات اقبال(اردو)،ص۳۸۵

(۵۹)کلیات اقبال(فارسی)،ص ۹۴

(۶۰)کلیات اقبال(فارسی)،ص ۹۶

(۶۱)کلیات اقبال(فارسی)،ص ۲۸۴

(۶۲)کلیات اقبال(فارسی)،ص ۴۲

خلاصہ کلام:

علامہ اقبال نے تصورِ خودی کی صورت میں جو نظریہ اخلاق دیا ہے وہ اُن کی ندرتِ فکر کا شاہکار ہے جو اُنہوں نے قرآن و حدیث اور اکابر صوفیاء کی تعلیمات سے اخذ کیا ہے۔ یہ نظریہ ایک طرف تو اسلامی تعلیمات کی روح کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور دوسری طرف فلسفیانہ معیار پر پورا اُترتا ہے۔ اس میں جہاں فرد کی ذاتی نشوونما اور تکمیل کا سامان موجود ہے وہاں اپنی ذات سے اُوپر اُٹھ کر ماحول اور معاشرہ میں اپنا جاندار کردار ادا کرنے کی ترغیب بھی موجود ہے۔ نظریہ خودی کے پہلے دو مراحل تسخیرِ ذات کے حوالے سے ہیں جب کہ تیسرا مرحلہ جو کہ نیابتِ الٰہی ہے وہ ایک بندۂ مومن سے ماحول کو مسخر کرنے اور اُس کی اصلاح کے حوالے سے اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کا تقاضا کرتا ہے جو کہ خلافتِ ارضی کے منصب کا تقاضا ہے۔

نظریہ خودی کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ آسان، عام فہم اور قابلِ عمل ہے۔ سادہ سی بات ہے کہ اطاعتِ الٰہی یعنی قرآن و سنت کی تعلیمات کی پابندی سے کام شروع کرنا ہے۔ ابتداء میں اس پابندی کے لیے خود پر کچھ جبر کرنا پڑے گا۔ رفتہ رفتہ طبیعت کے اندر نظم و ضبط پیدا ہو گا اور خوش دلی سے عمل کرنا آسان ہو جائے گا۔ جوں جوں انسان آگے بڑھتا چلا جائے گا ویسے ویسے اُس میں منصبِ خلافت یعنی نیابتِ الٰہی کی اہلیت اور کمالات پیدا ہوتے جائیں گے۔ تاہم اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مختلف لوگوں کے درمیان فہم و فراست اور استعداد کا جو فطری فرق ہوتا ہے وہ برقرار رہے گا۔ تمام لوگ یکساں درجے پر نہیں ہو سکتے بلکہ ہر شخص اپنی ذہانت فطانت، صلاحیت و استعداد اور سعی و محنت کے بقدر تکمیلِ خودی کے بلند درجہ تک جا سکے گا۔

☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

۱. القرآن الکریم

۲. بخاری، ابو عبد اللہ، محمد بن اسمعیل، (۱۹۸۷ء)، الصحیح، دار ابن کثیر الیمامہ، بیروت، لبنان۔

۳. جاوید اقبال، ڈاکٹر، (۱۹۹۶ء)، افکارِ اقبال، تشریحات جاوید، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان

۴. عبد الحکیم، خلیفہ، فکر اقبال، (۱۹۶۱ء)، بزم اقبال، لاہور، پاکستان

۵. محمد اقبال، علامہ، (۱۹۹۶ء)، کلیاتِ اقبال، (اُردو)، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان۔

۶. محمد اقبال، علامہ، (۱۹۹۶ء)، کلیاتِ اقبال (فارسی)، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان۔

۷. محمد اقبال، علامہ، (۱۹۹۶ء)، اسرارِ خودی، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان

۸. ملا علی، نور الدین بن سلطان محمد ہروی حنفی، (۱۴۲۲ھ)، مرقاۃ المفاتیح، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

۹. نذیر نیازی، سید، (۱۹۵۷ء)، مکتوباتِ اقبال، اقبال اکیڈمی، کراچی، پاکستان

۱۰. وحید عشرت، ڈاکٹر، (۱۹۸۹ء)، اقبال ۵۸ء (۵۸ء میں علامہ پر چھپنے والے مضامین کا انتخاب) اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان

11. Muhammad Iqbal, Allam, The Developement of Metaphysics in Persia, Bazam-i-Iqbal, Lahore.

شیخ احمد یحیٰ مُنیَرِیؒ اور ان کے مکتوبات کا اختصاصی مطالعہ

Shaykh Ahmad Yahyā Munyarī and specialized study of his letters

☆نادیہ عالم

ABSTRACT

A great Muslim personality who was born in East India in the seventh century AH, not only spread the true teachings of Islam in Bihar but in whole of India. His teachings drew people nearer to Allah Almighty and His Messenger (Sallallaho alehi wa aalehi wasallam), and warmed the hearts of masses with the love of these two. This great scholar and Waliullah (friend of Allah) was known as Hazrat Khawaja Sharafuddin Ahmad Yahya Muniri (May Allah have mercy on him). He not only educated and trained the people through his seminary and priory, but also used letters for this purpose. A look into his services reveals that he wrote more than three hundred and fifty letters to a wide circle of people, including his followers, contemporaries, ministers, lords and even the kings. Fortunately, these letters are still safe and available to us even today and are continuing to be a source of guidance to their readers. This article includes a brief introduction to these important and valuable letters written by Hazrat Khawaja Sharafuddin Ahmad and mentions some of the important features of these letters.

Keywords: Munyari, Sharafuddin Ahmad , Islam, Letters, Epistology

ساتویں صدی ہجری میں ہندوستان کے مشرقی علاقے بہار میں ایک ایسی عظیم شخصیت پیدا ہوئی جو بہار کی وجہ پہچان بنی،جس نے بہار کے علاقے کو شہرتِ دوام عطا کی۔ یعنی حضرت خواجہ شرف الدین احمد یحیٰ منیری علیہ الرحمہ۔ اس وقت ہندوستان میں خاندان غلاماں کے ساتویں بادشاہ علاءالدین مسعود (۶۴۴ھ-۶۶۴ھ) کی حکومت تھی۔ خواجہ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کا خاندان وہاں علم وفضل اور خاندانی سیادت کا حامل تھا۔ آپؒ کی حیثیت بہار میں روحانی بادشاہ کی مانند ہے۔آپؒ نے نہ صرف بہار کے علاقے بلکہ ہندوستان بھر میں علمِ شریعت اور حقیقت کو عام فرمایا۔ آٹھویں صدی ہجری میں آپؒ نے بہار میں تعلیم شریعت اور طریقت کا بیڑہ اٹھایا۔اس کے لیے آپؒ نے صرف تقریری صلاحیتوں سے ہی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ بالمشافہ رشد وہدایت کے علاوہ

☆پی۔ایچ۔ڈی اسکالر،لاہور یونیورسٹی،لاہور

مکتوبات کو تعلیم و تربیت کا اہم ذریعہ بنایا اور ان کے ذریعے تبلیغ، درس و تدریس کو پھیلانے کے لیے سعی بلیغ فرمائی۔ بلا شبہ آپؒ کی شخصیت اور آپؒ کی تصانیف اسلامی تاریخ کا بیش بہا خزانہ ہیں۔

شخصی آثار

آپ کے جدّ اعلیٰ (پردادا) امام محمد تاج فقیہ ؒ قدس خلیل (بیت المقدس) سے ۵۷۶ھ میں صوبہ بہار ضلع پٹنہ کے ایک قصبہ منیر (Munyar) میں تشریف لاکر اقامت گزیں ہوئے ۔ اس وقت منیر کا راجہ بہت ظالم اور سرکش تھا خصوصاً وہاں کے مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتا تھا۔یہ دیکھ کر حضرت امام تاج الدین فقیہ ؒ نے آمد کے چھٹے سال اس سے جہاد کرکے راجہ کو شکست دی اور منیر فتح کر لیا۔امام محمد تاج الدین کے تین صاحبزادے تھے۔ شیخ اسرائیل، شیخ اسماعیل اور شیخ عبدالعزیز۔زوجہ کی وفات کے بعد امام تاج الدین بیٹوں کو قائم مقام بناکر واپس بیت المقدس واپس چلے گئے۔ شیخ اسرائیل کے بڑے صاحبزادے حضرت یحیٰ (والد حضرت مخدومؒ) تھے ۔ ان کی شادی شیخ شہاب الدین جگ جوت سہروردیؒ کی بڑی صاحب زادی رضیہ بی بی سے ہوئی۔جن سے حضرت احمد یحیٰ منیری سمیت چار بیٹے پیدا ہوئے۔آپ کے تین بھائی شیخ جلیل الدین، شیخ خلیل الدین، اور شیخ حبیب الدین تھے۔آپ کی پیدائش ۲۶ -اوربروایت ۲۹ -شعبان المعظم ۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء میں قصبہ منیر میں ہوئی۔آپؒ کا نام احمد، شرف الحق والملۃ والدین لقب،جبکہ سید المتکلمین، سلطان المحققین، برہان العاشقین، قدوۃ العارفین، حجۃ اللہ فی الارض، شیخ الاسلام والمسلمین ، ولی البہار،مخدوم الملک ، مخدوم جہاں،قطب زماں ،مرشد الملک،شرف الحق اور شرف الملت وغیرہ خطابات ہیں۔(۱) اپنے قصبے منیر کی نسبت سے منیری کہلائے۔آپؒ کا خاندان ہاشمی قریشی ہے کہ و الد کی جانب سے آپؒ کا سلسلہ نسب پدری زبیر بن عبدالمطلب بن ہاشم سے ملتا ہے اور نسب مادری سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ سے۔

تحصیل علوم:

گھرپر ابتدائی مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپؒ کو مکتب داخل کروایا گیا۔اس زمانہ میں بہت سے ممالک اسلامیہ میں یہ دستور عام تھا کہ درسی کتابوں کے متون اور لغت کی مختصر کتب لفظ بلفظ یاد کروائی جاتی تھیں۔ تاکہ الفاظ کا ذخیرہ بچپن سے ہی محفوظ ہو جائے۔آپؒ نے اس طرزِ تعلیم پر اپنی بعض تحریروں میں تنقید کی ہے اور

(۱) صبیح الحق،شاہ،(۱۹۴۱ء)،ذکر الشرف،نظامی پریس،بدایوں۔ ص ۴۔

قوتِ حافظہ اور وقت کے غلط استعمال پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ بجائے قرآن مجید کے ایسی کتابیں رٹائی جاتی ہیں جو دین کے لیے زیادہ مفید نہیں۔ مثلاً معدن معانی کے چھٹے باب میں فرماتے ہیں :

”در ایام خوردگی چندیں کتابہا مارا یاد گردانیدند چنانکہ مصادر ومفتاح الغات ومقدار یک جلد یاد کرانیدند و ہر بار یاد تمام می شنیدند بائیست بجائے قرآن یاد می کرانیدند“(۲)

(بچپن میں استادوں نے بہت سی کتابیں یاد کروائیں، مثلاً مصادر، مصباح الغات وغیرہ مفتاح الغات بیس جزو کی کتاب ہوگی، ایک جلد کی مقدار کے برابر یاد کروائی۔ ہر مرتبہ زبانی سنتے تھے، اس کی بجائے قرآن مجید یاد کروانا چاہیے تھا)

آبائی علاقے میں تحصیل علم کے مواقع سے استفادہ کرلیا تو آپؒ کو حضرت علامہ اشرف الدّین ابوتوامہؒ (م۷۰۰ھ) جیسے استادِ کامل سے حصول علم کا موقع ملا۔ یوں کہ بلبن (۶۶۴ھ-۶۸۶ھ) کی ایما پر علامہ ابو توامہؒ دہلی سے سنار گاؤں تشریف لے گئے۔ اسی سفر میں بہار سے گزرتے ہوئے چند روز منیر میں قیام کیا۔ مخدومِ جہاں کی ملاقات ہوئی تو آپؒ شیخ ابو توامہؒ کے تبحرِ علمی اور صلاح و تقویٰ سے بہت متاثر ہوئے۔ ان سے تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ہوئی۔ والدین کی اجازت سے ان کے ساتھ ہی وطن چھوڑ کر سنار گاؤں آگئے اور ان سے تمام علوم دینیہ کا حصول کیا۔ اس دوران آپ کو اپنے اسباق اوردروس کے مطالعہ میں ایسا انہماک ہوتا تھا کہ ان کو چھوڑ کر دوسرے طلبہ کے ساتھ دسترخوان پر جانا ایک مشکل امر ہوتا تھا۔ مشفق استاد نے آپ کے اس انہماک اوردلچسپی کو دیکھ کر آپ کے لیے کھانا آپؒ کی خلوت گاہ تک پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ آپؒ نے وہاں انیتس سال کی عمر میں کلام پاک، تفسیر، حدیث، فقہ اور علم کلام کے علاوہ عقلی علوم مثلاً منطق، فلسفہ اور ریاضی کی تکمیل کی۔ ان کے علاوہ کئی کتب تصوف بھی مطالعہ میں رہیں۔ خود اس بات کا ذکر مکتوبات دوصدی کیا ہے۔ حضرت ابو توامہ نے چاہا کہ آپؒ کو دوسرے علوم بھی سکھائے جائیں، مگر آپؒ نے عرض کی کہ: ”مرا ہمین علوم دین بسندہ است“(۳) (میرے لیے صرف علمِ دین کافی ہے) اور استاد سے کیمیا و سیمیا وغیرہ علوم نہیں سیکھے۔

(۲) فردوسی، زین بدر، (س۔ن)، عربی۔ معدن المعانی۔ ملفوظات: حضرت احمد یحیٰ منیری، مطبع شرف الاخبار۔ ص ۴۳۔

(۳) فردوسی، شاہ شعیب، مناقب الاصفیاء، ص ۱۳۱-۱۳۲۔

ازدواجی زندگی:

حصول علم استاد صاحب نے ان کو رشتہ دامادی میں لینا چاہا۔ جسے استاد محترم کی دل جوئی کی خاطر منظور کر لیا۔نکاح کے بعد بھی آپؒ وہاں ہی قیام پزیر رہے۔ صاحب اولاد ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد بی بی صاحبہ وفات پا گئیں۔ پھر والد گرامی کی وفات کی اطلاع ملنے پر وطن واپس آ گئے۔

وطن واپسی:

والد کی وفات (۴) کی اطلاع ملی تو ۶۹۰ھ میں وطن واپسی ہوئی۔والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔کچھ عرصہ وہاں رہائش پذیر رہے۔ مگر طلب حق نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔اس کے لیے مرشد کی تلاش میں گھر چھوڑ دیا۔

تلاشِ مرشد اور سلسلۂ فردوسیہ میں بیعت

وطن واپسی کچھ عرصہ بعد تصفیہ نفس اور تجلیہ روح کے لیے گھر سے نکلنا چاہا کہ گوہرِ مقصود حاصل ہو (۵)۔والدہ سے اجازت لیتے ہوئے عرض کی کہ میرے بیٹے کو میری جگہ سمجھیں اور مجھے اللہ کی راہ میں آزاد فرما دیں۔ ۶۹۱ھ /۱۲۹۱ء میں دہلی آئے۔ مشائخ وقت کے ہاں حاضری دی مگر کسی سے بیعت نہ ہوئے۔پانی پت میں شیخ بو علی قلندر پانی پتیؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے مگر وہاں بھی اپنا مقصد نہیں پایا ان کے بارے میں یہ فرما کر واپس آ گئے کہ:

”شیخ است اما مغلوب حال است به تربیت دیگرے نمی پردازد“(۶)

(یعنی شیخ ہیں لیکن مغلوب الحال، دوسروں کی تربیت نہیں کر سکتے۔)

---

(۴) حضرت مخدومؒ کے والد حضرت یحیٰؒ کا وصال ۱۱/ شعبان المعظم ۶۹۰ھ کو ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی عمر میں ہوا تھا۔ مقدمہ مکتوبات صدی، ص ۱۸

(۵) فردوسی، شاہ شعیب، مناقب الاصفیا، ص ۱۳۲۔

(۶) فردوسی، شاہ شعیب، مناقب الاصفیاء۔ ص ۱۳۲۔

حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ سے بہت متاثر ہوئے۔ حضرتؒ اور آپ کی کچھ علمی گفتگو بھی ہوئی اور آپ اس سے بہت مطمئن ہوئے اور حضرت خواجہؒ سے بیعت کے لیے عرض کی۔ حضرت خواجہؒ نے اعزازواکرام فرمایا مگر بیعت نہیں کیا اور فرمایا:

"سیمرغیست نصیب دامِ ما نیست"(۷)

(یعنی ایک شاہین بلند پرواز ہے لیکن ہمارے جال کے لیے نہیں ہے)

فرمایا کہ تمھاری ارادت اور تعلیم سلوک برادرم نجیب الدین سے متعلق ہے ۔تم ان ہی کے پاس جاؤ وہ تمہارے منتظر ہیں ۔ جب مخدوم الملک جانے لگے تو ایک طشتری میں پان عطا فرمائے اور یہ فرمایا کہ فقیروں کے یہاں سے خالی نہ جاؤتم کو اس خاندان (سلسلہ)سے صفائی اور سماع مبارک ہو(۸) ۔ حضرت سلطان المشائخ کے فرمانے پر بڑے بھائی جلیل الدین ہمراہ خواجہ نجیب الدین فردوسیؒ(متوفیٰ۶۹۱ھ) کی خدمت میں حاضری دی ۔خواجہ نجیب الدین فردوسیؒ نے دیکھ کر فرمایا :

"درویش آؤ! برسوں سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں تا کہ تمھاری امانت تمھارے سپرد کروں"(۹)

مناقب الاصفیاؒ کے مؤلف نے لکھا ہے کہ خواجہ نجیب الدین فردوسیؒ نے بارہ سال قبل ہی آپؒ کے لیے اجازت نامہ لکھوا کر رکھا ہوا تھا۔

تربیت دربارِ رسالت مآب ﷺ کا مژدہ

شیخؒ نے آپؒ سے بیعت لی۔ساتھ ہی اجازت نامہ، خرقہ، شجرہ اور کچھ نصائح اور وصایا لکھ ساتھ دیں اور رخصت کر دیا۔ پھر فرمایا کہ راستہ میں اگر کوئی بری بھلی بات سنو تو واپس نہ آنا۔ آپؒ نے اپنی تعلیم وتربیت کے لیے کچھ دن قیام کرنے کی اجازت چاہی اور عرض کی کہ حضور! ابھی میں نے آپؒ کی کوئی خدمت نہیں کی، سلوک و طریقت کی کوئی روش معلوم نہیں کی، اس پر فقیر کو جو ذمہ داری دی جارہی ہے اس کی ادائیگی کس طرح ممکن ہو گی؟ اس پر خواجہ نجیب الدین فردوسیؒ نے فرمایا:

---

(۷)فردوسی، شاہ شعیب، مناقب الاصفیاء۔ ص ۱۳۲۔

(۸)عبدالرحمٰن، صباح الدین،(س۔ن)، تذکرہ اولیائے کرام، دارالمصنفین شبلی اکیڈیمی، اعظم گڑھ، انڈیا۔ ص ۲۶۰۔

(۹)عبدالرحمٰن، صباح الدین، تذکرہ اولیائے کرام، ص ۲۶۰۔

"من این اجازت نامه بفرمان حضرت رسالت محمد ﷺ نوشته ام نبوت ترا تربیت خواهد کرد"(۱۰)

"میں نے یہ اجازت نامہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے لکھا ہے ، تمھاری تعلیم و تربیت توبار گاہ رسالت ﷺ سے مقدر ہے)"

وطن واپسی پر راستے میں ہی شیخ کے وصال کی خبر سن لی مگر ان کی وصیت کا احترام کرتے ہوئے واپس نہیں لوٹے اور منیر کی طرف سفر جاری رکھا۔

خلوت گزینی

شیخ سے ملاقات کے بعد آپؒ کے دل میں عشق الٰہی کی لو پیدا ہوئی جو دن بدن بڑھتی ہی گئی۔اسے آپؒ نے مختصراً بلیغ انداز میں یوں بیان فرمایا:

"من چون بخواجه نجیب الدین فردوسی پیوستم حُزنی در دلِ من نهاده شد که هر روز آن حُزن زیاده میشد"(۱۱)

(میں جب سے خواجہ نجیب الدین فردوسیؒ سے ملا ہوں ،میرے دل میں غم و اندوہ کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ جس میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے)

جب بہیا کے جنگل (۱۲) کے قریب پہنچے تو مور کی آواز سنی ،ضبط نہ ہو سکا گریبان چاک کیا اور جنگل کی طرف گئے اور روپوش ہو گئے۔ منقول ہے کہ بارہ برس بہیا کے جنگل میں رہے۔پھر آپؒ کو راج گیر کے جنگل میں دیکھا گیا۔ یوں آپؒ نے تقریباً چالیس سال جنگلوں اور پہاڑوں میں بسر کیے۔(۱۳) ریاضت کے اس زمانہ میں کھانے پینے سے پرہیز کرتے جب کبھی بھوک کا غلبہ ہوتا تو درختوں کے پتے چبا کر بھوک کی شدت کو کم کرتے۔ شیخ مظفر بلخی نے ایک مرتبہ آپؒ سے دریافت فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ چالیس سال تک آپؒ نے کچھ

(۱۰)فردوسی،شاہ شعیب،مناقب الاصفیاً،ص ۱۳۲- ۱۳۳۔

(۱۱)فردوسی،شاہ شعیب،مناقب الاصفیاً،ص ۱۳۳۔

(۱۲)بہیا کا جنگل منیر سے تقریباً بیس میل دور مغرب کی جانب ضلع شاہ آباد میں ہے۔

(۱۳)منیری،احمد،شرف الدین،مکتوباتِ صدی،مقدمہ:محمد نعیم ندوی،ص۱۷۔

نہیں کھایا؟ فرمایا کہ ایسا نہ کہیں کہ کچھ بھی نہیں کھایا،ہاں ! ان چالیس سال میں غلہ کی قسم سے کوئی چیز نہیں کھائی۔ اس مدت میں میں نے کبھی گھاس، پتی اور کبھی کسی درخت کا پھل کھایا ہے۔(۱۴)

اس زمانہ میں کئی ہندو جوگیوں سے آپؒ کے روحانی معرکے بھی ہوئے جنہوں نے مغلوب ہو کر آپؒ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ (۱۵) اس دوران بعض طالبانِ حق آکر جنگل میں مستفید ہونے لگے تھے۔

بہار میں اقامت اور سلطان محمد تغلق کا خانقاہ تعمیر کروانا

آپؒ نے اذنِ الٰہی سے آبادی کا رخ فرمایا۔ آغاز میں نمازِ جمعہ کے لیے بہار کی جامع مسجد میں تشریف لانے لگے۔ اس دوران مشتاقان کا ذوق و شوق بھی بڑھا اور تعداد بھی۔ رفتہ رفتہ لوگوں کے اصرار پر سے اسی قصبہ میں رہائش اختیار فرمائی۔سلطان محمد تغلق کو جب آپ کی بزرگی اور درویشی کے بارے میں علم ہوا تو اس نے بہار کے گورنر مجد الملک کو فرمان جاری کیا کہ وہ آپؒ کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کروائے۔ساتھ ہی اخراجات کے لیے پرگنہ راجگیر ان کے حوالے کردے۔ اگر وہ قبول نہ کریں تو زبردستی دے کر آئے۔ آپؒ نے جبر کراہت سے یہ جاگیر قبول کی۔مگر اسے اپنے لیے ایک بوجھ سمجھتے رہے ۔

دنیا سے بے رغبتی کی اعلیٰ مثال

سلطان محمد تغلق کی وفات کے جب فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا تو آپؒ اس سے ملنے بنفسِ نفیس دہلی تشریف لے گئے۔جب یہ اطلاع دہلی پہنچی یہ حضرت مخدوم جہاں بادشاہ سے ملنے آرہے ہیں تو درباریوں کو خیال ہوا کہ وہ اپنی جاگیر میں اضافے کے خیال سے آ رہے ہیں۔ فیروز شاہ کو جب اس کی خبر دی گئی تو اس نے کہا کہ اگر مخدومِ جہاں تمام اقطاع بہار بھی چاہیں تو میں ان کو پیش کر دوں گا ۔مگر جب ملاقات ہوئی تو مخدوم جہاں نے فرمایا کہ ایک عرض لے کر آیا ہوں اگر قبولیت کا وعدہ ہو تو بیان کروں۔ سلطان کے اقرار پر آستین سے جاگیر کی سند نکال کر سلطان کے ہاتھ میں تھمائی اور فرمایا کہ خدارا اسے واپس لے لیجیے یہ میرے کسی کام کی نہیں۔ یہ سن کر تمام درباری اور بادشاہ ششدر رہ گئے۔ سلطان نے پھر بھی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے بڑے اصرار سے ایک بڑی رقم پیش کی۔آپؒ نے سلطان کے اصرار پر قبول تو فرما لی مگر دربار سے باہر نکلتے ہی سب فقرا ٔ اور مساکین میں تقسیم فرما دیا اور اپنی درویشانہ استغناٗ کے ساتھ وطن مراجعت فرمائی۔ درس و تدریس اور رشد و

---

(۱۴)فردوسی، شیخ احمد لنگر دریا، (۲۰۱۰ء)، مونس القلوب، مترجم:ڈاکٹر محمد علی ارشد شرفی، بہار (نالندہ)، مکتبۂ الشرف. ص۸۷۔

(۱۵)عبد الرحمٰن، صباح الدین، تذکرہ اولیائے کرام، ص۳۷۸۔

ہدایت کا سلسلہ جاری فرمایا۔ پھر تقریباً نصف صدی سے زائد سال اپنی خانقاہ میں رونق افروز رہے اور اپنے سر چشمہ فیض سے عوام و خواص کو سیراب فرماتے رہے۔

پسندیدہ عادات واطوار

آپؒ سادہ مزاج اور اطوار کے حامل تھے۔ اخلاق خلق محمدی ﷺ کا نمونہ تھا۔ جو شخص ملتا اس سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے۔ اگر وہ کوئی حاجت پیش کرتا اسے پوری فرماتے۔ اس بارے میں آپؒ کو بہت خیال رہتا۔ دوسروں کو بھی خلق کی حاجت روائی کی تاکید و تلقین فرماتے۔ رسوم کی بیجا پابندی کے قائل نہ تھے۔ فرماتے کہ جو مشائخوں کا خرقہ پہنے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ رسوم کے بت توڑ ڈالے اور زنار عادت کو کاٹ دے۔ کسی کی دل شکنی منظور نہ تھی، کوئی دعوت کرتا تو روزہ سے بھی ہوتے تو اسے توڑ ڈالتے اور دعوت قبول کرتے اور فرماتے کہ روزہ کی قضا ہے مگر شکستگیٔ دل کی قضا کوئی نہیں ۔ عجز و فروتنی غایت درجہ تھی اور اپنی حالت کے استتار کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ اظہار ِکرامت سے نفرت تھی۔ فرماتے کہ عارف کے لیے کرامت بت ہے۔ اگر کرامت سے دل کو سکون ہو تو حجاب میں آ جائے گا ۔ اگر کرامات سے منہ پھیر لے اور خود کو علیحدہ کر لے تو قربت حاصل ہو اور حجابات رفع ہو جائیں۔ آپؒ اعلیٰ درجہ کے پابندِ شرع تھے۔ حتیٰ کہ وفات کے دن بڑی نقاہت اور ضعف کی حالت میں وضو فرمایا اور منہ دھونے میں سہو ہو گیا۔ جب اسکا ذکر کیا گیا تو یہ نہیں فرمایا کہ صرف منہ دھو لیں لیں بلکہ دوبارہ سے تمام آداب کے ساتھ وضو فرمایا۔ اعزہ و اقربا سے فیاضانہ برتاؤ فرماتے اور صلہ رحمی کا بہت دھیان رکھتے۔ معاصرین بزرگوں سے بھی مکتوبات اور تحائف کے ساتھ رابطے میں رہتے۔ مریدین کے ساتھ سلوک بہترین تھا۔ غرض جو جس کا منصب تھا ویسے ہی اس کا خیال فرماتے تھے۔[(۱۶)]

اولاد:

"ذکر شرف" میں مولانا شاہ صبیح الحق بیان کرتے ہیں کہ حضرت مخدومؒ کی اولاد میں تین صاحبزادے تھے ۔ جن میں سے دو صاحبزادے صغر سنی میں وفات پا گئے تھے۔ صرف مخدوم ذکی الدین آپؒ کے ہمراہ منیر آئے تھے۔[(۱۷)] ابو الحسن ندوی دعوت و عزیمت میں "سیرۃ الشرف" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شاہ ذکی

---

(۱۶) صبیح الحق، شاہ، ذکر الشرف، ص ۱۰-۱۳۔

(۱۷) صبیح الحق، ذکر الشرف، ص۶۔

الدین آپؒ کی حیات میں ہی ایک بیٹی 'بارکہ' چھوڑ کر وفات پا گئے تھے۔بارکہ کا بیاہ سید وحیدالدین رضوی، خواہر زادہ شیخ نجیب الدین فردوسیؒ سے ہوا تھا۔حضرت مخدوم جہاںؒ کی نسل اس پوتی سے ہی آگے بڑھی۔(۱۸) بی بی فاطمہ اور بی بی زہرہ دو صاحبزادیاں تھیں۔ بی بی فاطمہ کی شادی حضرت مخدوم کے بھتیجے شاہ خلیل الدین فردوسی کے بیٹے شاہ اشرف منیری سے ہوئی تھی۔ان سے صاحبان منیر کا سلسلہ نسب ملتا ہے۔ جبکہ بی بی زہرہ کی شادی حضرت شاہ قمر الدین بن مولانا میر شمس الدین مازندرانی سے ہوئی تھی۔ دونوں صاحبزادیوں کے مزارات بڑی درگاہ منیر شریف میں ہیں۔(۱۹)

وصال وتدفین

سلطان تغلق(۷۵۲ھ-۷۹۰ھ)کے عہد میں منیر میں ہی جمعرات ٦/شوال ۷۸۲ھ / ۱۳۸۱ء کو ایک سو اکیس سال (بمطابق ایک سو اٹھارہ عیسوی سال)کی عمر میں وفات پائی۔بوقتِ وصال آپؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے جنازے کی نماز ایسا شخص پڑھائے جو صحیح النسب سید ہو ،تارکِ سلطنت ہواور حافظِ قرأتِ سبعہ ہو۔چنانچہ جنازہ تیار کر کے راستہ پر رکھا ہوا تھا اور لوگ ایسے شخص کے منتظر تھے۔ یکایک حضرت مولانا سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ(۲۰) تشریف لائے ۔ وہؒ دہلی سے سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ شیخ علاء الدین پنڈویؒ کی خدمت میں بنگالہ جا رہے تھے۔شیخ سمنانیؒ میں یہ تینوں شرائط موجود تھیں۔ چنانچہ آپؒ نے حضرت مخدوم کی نماز جنازہ پڑھائی اور قبر میں اتارا۔(۲۱) صاحبِ سیرۃ الشرف کے مطابق حضرت مخدومؒ کی قبر مبارک کچی ہے اور اس پر کوئی گنبد نہیں ہے۔عہد سوری میں آپؒ کے مزار کے گرد کئی مکانات، مسجد اور فوارہ کی تعمیر کی گئی مگر حضرت مخدومؒ کی اتباع شریعت کے پاس میں مزار مبارک کو اس کی اصل حالت پر ہی رہنے دیا گیا۔(۲۲)

---

(۱۸)ندوی، ابوالحسن علی،(۲۰۱۰ء)، تاریخ دعوت وعزیمت، مجلس تحقیقات نشریات اسلام، لکھنؤ، انڈیا۔ ۲۳۷/۳۔

(۱۹)محب الرسول، محمد، شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری،(دینی خدمات اور انکے اثرات ونتائج)، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، ص۱۱۔

(۲۰)حضرت سید جہانگیر اشرف سمنانیؒ کے تفصیلی حالات آگے ان کے مکتوبات کے ذکر میں آرہے ہیں۔

(۲۱)منیری، احمد یحیٰ،(۱۳۹٦ھ)، مکتوبات صدی، مترجم: سید نجم الدین احمد فردوسی وسید الیاس، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی. ص۲۰۔

(۲۲)ندوی، ابوالحسن علی، تاریخ دعوت وعزیمت، ۲۳۷/۳۔

خلفاؑومریدین

آپؒ کے مریدین کی تعداد تقریباً ایک لاکھ بیان کی جاتی ہے ۔ مناقب الاصفیاؔ کے مؤلف شیخ حسین معز بلخی کا قول نقل کرتے ہیں کہ شیخ جہاں کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی جن میں سے چالیس واصل بحق تھے۔بعض کے نزدیک تین سو مریدین واصل بحق تھے۔(۲۳) بعض جگہوں پر آپؒ کے تین سو تیرہ خلفاؑ کا ذکر آتا ہے۔ آپؒ کے سب سے چہیتے مرید و خلیفہ مولانا مظفر بلخیؒ تھے۔ ان کے علاوہ شیخ حسین نوشہ توحید بلخیؒ،مولانا رکن الدینؒ، شیخ زین الدین عربیؒ اور مولانا نصیر الدین جونپوری صاحبان علم و فضل اور آپؒ کے اہم خلفاؑ میں شمار ہوتے ہیں۔ سیرۃ الشرف کے حوالے سے ابوالحسن علی ندوی نے آپؒ کے لگ بھگ پچاس مریدین کی فہرست دی ہے۔(۲۴)

علمی آثار

آپؒ کی تصانیف کثرت سے ہیں ۔مگر آپؒ کے مکتوبات زیادہ مشہور ہیں ۔آپؒ کی تصانیف کے مطالعہ سے آپؒ کے تبحر علمی اور وسعت نظر کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ علومِ ظاہری کی شائد ہی کوئی شاخ ایسی ہو جس سے آپؒ کا کوئی تعلق نہ ہو اور صنف میں کچھ لکھا نہ ہو۔علمائے سلف کی صفِ اول میں آپ کو جگہ دی گئی ہے۔آپؒ شاعر بھی تھےاور مشرف ؔتخلص کرتے تھے۔(۲۵)کسی دیوان کا علم نہیں مگر فالنامے اور دوہے موجود ہیں۔اکثر مکتوبات میں بلا تکلف وجابجا اشعار کی موجودگی آپؒ کے عمدہ شعری ذوق کی عکاس ہے ۔ آپؒ کے اہل خاندان توآپؒ کی تقریباًسترہ سو تصانیف کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اب تک صرف درج ذیل کتب کا علم ہو سکا ہے۔

کتب ورسائل:

۱-شرح آداب المریدین ،۲-ارشادالطالبین،۳ -ارشادالسالکین،۴-رسالہ مکیہ وذکرِ فردوسیہ ،۵-فوائد المریدین، ۶-رسالہ ٔ اشارات، ۷-اوراد کلاں، ۸-اورادِ اوسط،۹- اورادِ خورد،۱۰-رسالہ درطلب طالباں،۱۱-

(۲۳)فردوسی،شاہ شعیب،مناقب الاصفیاء،ص۱۳۹۔

(۲۴)ندوی،ابوالحسن علی،تاریخ دعوت وعزیمت،۳/ ۲۳۸-۲۳۹۔

(۲۵) ۱۸-۱۱-۲۸مہتاب جہاں/منیر کی چھوٹی بڑی درگاہوں کی تاریخی اہمیت/قومی اردو کونسل برائے اردوزبان ncpulblog.blogspot.com

زادسفر، ۱۲-لطائفِ اشرفی، ۱۳ -عقائد اشرفی ،۱۴-رسالہ در ہدائتِ حال، ۱۵- رسالہ وصول الی اللہ، ۱۶- مرآۃالمحققین، ۱۷-رسالہ اجوبہ ۔

ملفوظات:

مخدومِ جہاںؒ کے ملفوظات کے بہت سے مجموعے ترتیب دیئے گئے ہیں مثلاً:

۱-معدن المعانی،۲- خوانِ پر نعمت۳ -راحت القلوب،۴-مخ المعانی،۵-مونس المریدین،۶-گنج لا یفنیٰ،۷-فوائد الغیبی ۸-معزالمعانی،۹- بحر المعانی(کنزالمعانی؟) ۱۰-ملفوظ الصغر،۱۱-تحفہ غیبی۔

مکتوباتِ منیری اوران کا اجمالی تعارف

حضرت مخدوم جہاںؒ کو فارسی لکھنے میں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔آپؒ کے مکتوبات کے کئی مجموعے ہیں۔ ان میں ''مکتوبات صدی'' ''مکتوبات دو صدی''،''مکتوبات بست و ہشت'' اور ''مکتوبات سہ صدی ''مشہور ہیں۔ مکتوبات کی زبان صاف، نکھری ہوئی اور تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔خالق و مخلوق کا باہمی تعلق اور اخلاقِ انسانی سے متعلق مضامین پر بکثرت تحریر فرمایا ہے۔مجموعی طور پر ساڑھے تین سو سے زائد ان مکتوبات کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آپؒ کے مکتب الیہم کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ آپؒ نے اپنے مریدین اور علمائے کرام کے علاوہ کئی اربابِ حکومت کو بھی مکتوبات تحریر فرمائےاور انہیں رعایاسے نیک سلوک اور عدل و انصاف کرنے کی تلقین فرمائی۔

مکتوباتِ صدی:

یہ مکتوبات آپؒ کے ایک مرید خاص قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کے نام ہیں۔وہ اپنی غیر معمولی مشغولیت اور فرائض منصبی کی انجام دہی کی وجہ سے آپؒ کی خدمت میں حاضری سے معذور تھے۔ان کے اصرار پر ان کی تعلیم، اصلاح اور راہنمائی کے لیے یہ خطوط ۷۴۷ھ میں لکھے گئے۔ مکتوبات صدی کے چوتھے مکتوب میں ان مکتوبات کے تحریر کرنے کے بارے حضرت مخدوم جہاںؒ لکھتے ہیں:

> ''تمہیں معلوم ہو کہ مکرر سہ کررتمہاری درخواستیں متقاضی تھیں کہ کچھ لکھا جائے اور ہر سوال کے متعلق ارشاد و تنبیہ کی جائے ۔تقاضا اس حد تک تھا کہ تم شکستہ خاطر ہونے لگے تھے۔اس لیے چند مکتوب مسلسل لکھے جاتے ہیں۔انہیں کافی غور سے پڑھنا اور قاضی صدر الدین سے مطالب حل کروالینا۔

مجھے یقین ہے کہ ان کے وہاں ہوتے کوئی مشکل نہیں رہے گی، مگر اس کے ساتھ بقدرِ وسعت عمل بھی شرط ہے کیونکہ اصل کام عمل کرنا ہی ہے"(۲۶)

مکتوباتِ صدی کے نام سے ہی ظاہر ہے اس میں سو مکتوب شامل ہیں۔ ان میں تصوف کے تمام اہم مسائل زیرِ بحث لائے گئے ہیں اور مکتوب الیہ کی سمجھ کے مطابق انھیں دلائل و امثال سے محققانہ انداز میں سمجھایا ہے۔ ان مکتوبات میں آپؒ نے توبہؒ و ارادت، توحید و معرفت، مراتب و مقامات سالکین، احوال و معاملات مریدین ،عشق و محبت ، عبودیت و بندگی، تجرید و تفرید، کوشش و ملامت پیری اور مریدی کے نہایت اہم ،ضروری اور مفید مضامین کو احادیث مبارکہ اور بزرگانِ سلف کی حکایات و ہدایات کے ذریعے تحریر فرمایا ہے۔ ان مکتوبات کو آپ ؒکے مرید خاص اور کاتب مولانا زین بدر عربیؒ نے قلم بند کیا تھا اور ایک نقل اپنے پاس رکھ لی تھی۔ جو آج ایک قیمتی ذخیرے کی شکل میں محفوظ ہے۔اس مجموعہ مکاتیب کا ایک نسخہ مطبع نول کشور سے اور ایک نسخہ مطبع علوی محمد علی بخش خان نقشبندی میں چھپا تھا۔ جس کا اردو ترجمہ کراچی سے سعید ایم ایچ کمپنی نے ۱۳۹۶ھ میں شائع کیا تھا۔

مکتوباتِ دوصدی:

مکتوباتِ صدی کے ۲۲ سال بعد مکتوباتِ دوصدی کی تکمیل ہوئی۔یہ مکتوبات کسی ایک شخص کے نام نہیں ہیں بلکہ مختلف مریدوں، شاہانِ وقت، مختلف امراً اور قضاۃ کے نام لکھے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض مباحث میں توارد و تکرار پیدا ہوگیا ہے۔آپؒ نے یہ مکتوبات تصوف ، اخلاق اور فلسفہ کے موضوعات پر ان لوگوں کی رشد و ہدایت کے لیے لکھے جو آپ کی مجلس میں کسی وجہ سے حاضر نہ ہو سکتے تھے(۲۷)۔ ان کے مکتوب الیہم میں والدہ ماجدہ، شیخ عمر، قاضی شمس الدین، قاضی زاہد، قاضی حسام الدین، مولانا کمال الدین سنتوشی، مولانا صدر الدین، مولانا ضیاء الدین، مولانا رفیع الدین،، مولانا تقی الدین، مولانا محمود سنگانی، شیخ محمد ظفر، شیخ قطب الدین، شیخ سلیمان، شیخ عمر دیوانہ، شیخ اسحٰق مغربی، رضی الملک محمود،امام تاج الدین،امام افتخار،خواجہ سلیمان،خواجہ احمد، خواجہ مہذب، مولانا نصیر الدین،مولانا بایزید، ملک الامراً، ملک مفرح، ملک خضر، امین خان، ملک معز الدین، داور ملک (داماد سلطان)، سلطان ہند محمد شاہ تغلق اور فیروز شاہ تغلق شامل ہیں۔ان کے علاوہ کئی مکاتیب مکتوب الیہ کے نام کے بغیر بھی مجموعہ میں شامل ہیں۔ اس مجموعہ مکاتیب کے جامع بھی مولانا زین بدر عربیؒ ہیں ۔ یہاں بھی نام سے ظاہر ہے کہ

---

(۲۶) منیری، شرف الدین، مکتوبات صدی، ص۶۹۔

(۲۷) محمد اکرام، (۱۹۸۷ء)، آبِ کوثر، تاج کمپنی، ترکمان گیٹ، دہلی، انڈیا۔ ص۴۳۹۔

اس مجموعہ میں دو سو مکتوبات شامل ہیں۔اصل میں اس مجموعہ میں دو سو آٹھ مکاتیب ہیں۔ یہ مجموعہ اور اس کا ترجمہ دونوں چھپ چکے ہیں۔

مکتوبات سہ صدی:

آپؒ کے مکاتیب کا ایک نسخہ سہ صدی مکتوبات کے نام سے کتب خانہ اسلام پنجاب لاہور سے بھی شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں مکتوباتِ صدی اور مکتوباتِ دوصدی کے علاوہ مکتوبات ہشت و بست بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

فوائدِ رکنی:

یہ مکتوبات اپنے مرید خاص حضرت رکن الدینؒ کے سفر حج کے لیے تحریر فرمائے۔انھوں نے مخدومِ جہاںؒ سے درخواست کی تھی کہ درویش کے لیے مکتوبات کے ذریعے چند فوائد تحریر فرما دیں تاکہ سفر و حضر میں مونسِ روزگار ثابت ہوں۔ آپؒ نے ان کے لیے چوالیس صفحات پر مشتمل مکاتیب کی صورت میں اٹھارہ فوائد تحریر فرمائے۔ اس میں عشقِ الٰہی، انسانی برتری، راہ طریقت میں محنت و ریاضت، دنیا سے قطع تعلقی، تواضع و انکسار، روحانی گرسنگی اور صوفیائے کرام کے رموزو اشارات پر نہایت خوبصورت، جامع اور اہم مباحث شامل ہیں۔

مکتوبات جوابی / مکتوبات بست وہشت:

دو سو سے زائد مکاتیب آپؒ نے اپنے عزیز ترین مرید مظفر بلخیؒ کو لکھے تھے۔جن میں زیادہ تر راہِ سلوک میں پیش آنے والی مشکلات کا حل اور اس راہ میں ترقی و کیفیات کا بیان تھا۔ان سے شیخ مظفر بلخیؒ کے علوئے استعدادا اور ان پر انعامات الٰہیہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔صد افسوس کہ مظفر بلخیؒ کی وصیت کے مطابق یہ مکاتیب ان کے ساتھ ہی دفن کر دیئے گئے۔ مگراس سے قبل اتفاقاً چند مکتوبات پر ان کے خدام کی نظر پڑی تو انہوں ان کو نقل کر لیا تھا۔ یہ کل اٹھائیس مکاتیب تھے جنہیں کتابی شکل دے کر شائع کیا گیا(۲۸)۔ انہیں مکتوبات جوابی کا نام دیا گیا ہے اور تعداد کے لحاظ سے انہیں مکتوبات بست وہشت بھی کہا جاتا ہے۔

---

(۲۸) شرف الدین منیری، مکتوباتِ صدی، ص ۳۰۔

مکتوبات کی دعوتی و علمی حیثیت اور اہمیت

یہ مکاتیب حضرت مخدومؒ کی زندہ یادگار اور آپؒ کے علوم و کمالات کے بہترین عکاس ہیں۔یہ نہ صرف اس زمانہ کی تصانیف میں ، بلکہ معرفت و حقائق کے پورے اسلامی ذخیرے میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ علم کی گہرائی ،ذاتی تجربات، مجتہدانہ نظر،کتاب و سنت کے صحیح فہم،شریعت کی حمایت اور وجد انگیز نکات کے اعتبار سے پورے اسلامی کتب خانہ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ علوم و معارف کے علاوہ یہ مکتوبات زورِ قلم، قوت بیانی اور حسنِ انشاٗ کا بھی بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے اکثر حصے فارسی ادب و انشاٗ کے نہایت اعلیٰ اور کامیاب مظاہر ہیں اور اس قابل ہیں کہ انہیں دنیا کے بہترین ادبی نمونوں میں شامل کیا جائے۔خواجہ مخدومِ جہاںؒ کے تبحرِ علمی کا اعتراف صوفیائے عظام اور علمائے کرام دونوں طبقات کو ہے۔ دونوں کو اس امر کا اعتراف ہے کہ آپ کا قلم سرِ مو بھی شریعت سے باہر قدم نہیں رکھتا۔ اپنے مکتوبات میں جو کچھ آپؒ نے رقم فرمایا اس سے شریعت و طریقت کی حقیقت وغایت اور بزرگان دین کی تعلیمات اور ان کی وضاحت بڑے احسن طریقے سے سامنے آتی ہے۔

حضرت مخدوم جہاںؒ نے یہ مکتوبات تدریجاً مختلف اوقات اور موقع بموقع ضرورت کے مطابق مکتوب الیہ اور سائل کی فہم اور استعداد کے مطابق رقم فرمائے ۔ جو اپنے فرائض منصبی، اہل و عیال کی پرورش، اور اسباب و وسائل آمدورفت کی کمی کی بنا صحبت کی نعمت سے محروم تھے۔ان میں بعض کی التجا پر کہ حضرت مخدومؒ جہاں اپنے علوم و فضل سے ایسی تحریر بھیجیں جو مونسِ وقت ہو، جس کے مطالعہ سے رشد و ہدایت حاصل ہو اور راہ کی دشواریاں حل ہوجائیں۔آپؒ نے کمال و مہربانی سے انہیں اور(ان کے علاوہ بغیر درخواست کے بھی) حق خدمت رکھنے والے متعلقین کو آیات و احادیث، حکایات و معرفت بھرے کلمات ارقام فرمائے اور ہر طرف جانے والوں کے ساتھ ان مکتوبات کے بھیجنے کا انتظام فرمایا۔ تاکہ وہ ان مکتوبات سے سیدھی راہ ، اس پر چلنے کی قوت و استحکام پائیں اور شدتِ ابتلاٗ یاکسی بھی افتاد میں شرع کی حدود سے باہر نہ نکلنے پائیں۔ ان مکتوبات میں آپؒ نے انہیں شریعت کے احکامات سے ہی آگاہ نہیں فرمایا، طریقت کی راہوں سے بھی آشنا کیا ہے۔ آپؒ نے راہ کی مشکلات سے روشناس کرواتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کی طرف متوجہ کرتے ہوئے، سب کو عمل و کوشش کی طرف ایسے احسن طریقے سے راغب فرمایا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ پھر حکمران طبقہ کو اس کی فرائضی ذمہ داریوں کے لحاظ سے یا ان کی قلبی راہنمائی کی مناسبت سے بھی مکتوبات لکھے ۔ ان میں انہیں متعلقہ احادیث مبارکہ تحریر فرماکر حضور اکرم ﷺ کے احکام و فرمودات سے روشناس کروایا اور حکمرانی میں رعایا اور زیر دستوں کے بارے میں نبی کریم ﷺ اور بزرگوں کی تعلیمات سے آگاہ فرمایا۔

مکتوبات منیریؒ کے بارے میں بزرگان دین اور علمائے کرام کی آراء:

بزرگان دین اور علمائے کرام نے ان مکتوبات کی بہت تعریف کی ہے۔ ان میں سے چند بزرگوں کا اظہار خیال شامل مقالہ ہے۔ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے جب ان مکتوبات کا مطالعہ کیا تو ایک دن حالتِ استغراق میں فرمایا:

"سبحان اللہ! شیخ شرف الدین أحمد یحی منیری کفر صد سالہ ما بر کفد ست"(۲۹)

"سبحان اللہ! شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیریؒ نے ہمارے سو سالہ کفر کو ہتھیلی پر رکھ کر دکھا دیا ہے)"

مناقب الاصفیاء کے مؤلف لکھتے ہیں کہ حضرت سید جلال الدین بخاریؒ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ آخری عمر میں آپؒ کی کیا مشغولیت ہے؟ فرمایا! شیخ شرف الدین منیریؒ کے مکتوبات کے مطالعہ میں مشغول ہوں۔ پھر ان مکتوبات کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ یہ مکتوبات کیسے ہیں؟ تو فرمایا:

"بعضے محل ہنوز فہم نشدہ است"(۳۰) (کہ کچھ مقامات ابھی بھی میری سمجھ میں نہیں آئے)

آپ کے مکتوبات کے بارے میں شیخ عبد الحق اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں :

"او را تصانیف عالی است، از جملہ تصانیف او مکتوبات مشہور و لطیف ترین تصانیف اوست، بسیاری از آدابِ طریقت و اسرارِ حقیقت در آنجا اندارج یافتہ، وملفوظات اورانزدیکی از معتقدان او جمع کردہ اما لطافت مکتوبات او بیشترست"(۳۱)

(آپ کی تصنیفات بھی کثرت سے ہیں جن میں مکتوبات زیادہ مشہور ہیں۔ اس لحاظ سے بھی یہ بے نظیر و بہترین ہیں کہ ان میں آداب طریقت اوررموزِ حقیقت بیان کئے گئے ہیں ۔ان کے ملفوظات ان کے ماننے والے نے جمع کئے ہیں۔ مگر ان کے ملفوطات کی نسبت ان کے مکتوبات میں لطافت و شیرینی کا پہلو زیادہ نمایاں ہے)

سیرۃ الشرف کے مؤلف سید ضمیر الدین احمد لکھتے ہیں:

---

(۲۹) فردوسی، شاہ شعیب، مناقب الاصفیاء، ص ۱۴۰۔

(۳۰) ایضاً

(۳۱) دہلوی، عبد الحق محدث، (۲۰۱۵ء)، اخبار الاخیار مع مکتوبات، النوریہ رضویہ پبلشنگ کمپنی، لاہور۔ ص ۱۱۷۔

"اگر ان مکتوبات کے مضمون کو خیال کرو اور انؒ کی غرض کو سوچو تو تم کو معلوم ہو جائے گا سب مکتوبات کا مضمون رشتۂ خداوندی اور بندگی ہے"(۳۲)

غرض سلاطین دہلی کے زمانہ میں لکھے گئے جن رسائل و مکتوبات نے سب سے زیادہ شہرت پائی اور کبار صوفیائے کرامؒ کے نزدیک تعلیم و تربیت نفس کے ایک دستور العمل کی حیثیت حاصل کر لی۔ وہ مکتوبات شرف الدین یحیٰ منیری تھے۔

شیخ احمد یحیٰ منیریؒ کی نظر میں اپنے مکتوبات کی اہمیت:

آپؒ نے زیادہ تر مکتوبات ملک شمس الدین کو ان کی دوری اور مصروفیت کی بنا پر تحریر فرمائے اوران کے ذریعے قاضی صاحب کی اصلاح و تربیت فرمائی۔ان مکتوبات میں آپؒ اپنے مکتوبات کی اہمیت بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں اور ان کے فوائد و ثمرات سے بہرہ مند ہونے کے قواعد کے متعلق یوں وضاحت فرماتے ہیں :

"اس فقیر کے مکتوبات اور ملفوظات جو وہاں پہنچے ہیں،انہیں آداب کے ساتھ مطالعہ کیجئے،اور ان پر اپنی وسعت اور قوت کے مطابق عمل کیجئے، اس قانون کے تحت کہ قلم بھی زبانوں میں سے ایک زبان ہے، ملفوظات و مکتوبات کا وظیفہ یوں تصور کرو کہ گویا فقیر کی زبان سے سن رہے ہو"(۳۳)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"برادرِ عزیز جو کچھ میں تمھیں لکھتا رہا ہوں اسے حضوریٔ دل سے پڑھتے رہو عادتاً نہیں ۔اس لئے کہ یہ قصہ اور افسانہ نہیں ہے۔ (اگر) تنہائی میں مطالعہ کرو تو اور بہتر ہے۔"(۳۴)

مکتوبات دوصدی کے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"القلم احد اللسانین (قلم دو زبانوں میں سے ایک زبان ہے) کی بنا پر اس دعا گو کے جو مکتوب آن عزیز کو پہنچتے ہیں یا پہنچیں گے وہ سب اس دعا گو کی زبان سے ہے اور جو بات میری زبان سے نکلی وہ میرے دل سے نکلی ہوئی ہے اور جب تم نے میری زبان کے حکم کو مانا تو میرے دل کے حکم کو قبول کیا(من یطیع اللسان فقد اطاع القلب و من یطیع الرسول فقد اطاع اللہ) یعنی 'جس نے زبان کی اطاعت کی اس نے دل کی

(۳۲)احمد، ضمیر الدین، سیرۃ الشرف، ص۳۴۹۔

(۳۳)منیری، احمد یحیٰ شرف الدین، (۲۰۰۳ء)، مکتوبات دوصدی، مترجم: شاہ قسیم الدین، سیرت فاؤنڈیشن، لاہور. ص۱۷۔

(۳۴)ایضاً۔

اطاعت کی اور جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی' جب تم نے دیکھ لیا کہ یہ ایک ہی ہے تو اس میں غور وفکر (کیا) کرو"(۳۵)

اسی مکتوب کے آخر میں فرماتے ہیں:

" اسی طرح اپنا حال برابر لکھا کرو۔ انشأ اللہ تعالیٰ! یہی لکھنا ممکن ہے (مغفرت کا) بہانہ بن جائے، میرے اور تمہارے نصیب میں لکھنے اور پڑھنے کے سوا رکھا ہی کیا ہے، شاید یہ لکھا ہوا کسی کے کام آئے اور وہ ایسا شخص ہو جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے اور تمہیں قبول فرمالیں۔ اسے بھی کم نہ سمجھو کہ ڈوبنے والوں کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے"(۳۶)

تعلیمات الشرفؒ:

آپؒ کی تعلیمات کا بڑا ذخیرہ آپؒ کے ملفوظات اور مکتوبات کی شکل میں موجود و محفوظ ہے۔ ایک اور اہم اور بنیادی ذریعہ تعلیم آپؒ کی علمی مجالس تھیں جن میں بہت سے اہم مسائل حل ہوتے تھے۔ ان مجالس میں مریدین کے علاوہ بھی دیگر کئی لوگ مستفید ہوتے تھے۔ آپ کے مکتوبات کا زیادہ حصہ آپؒ کی حیات مبارکہ میں ہی عام ہو چکا تھا۔ جن سے مریدین و غیر مرید دونوں نے فائدہ اٹھایا۔ مریدوں کی مجاہدہ، اذکار و اشغال کے ذریعے آپؒ کس طرح تربیت فرماتے تھے؟ آج اس کا علم مشکل ہے۔ ہاں آپؒ کے ملفوظات میں ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ آپؒ نے کس طرح ان کی تعلیم و تربیت فرمائی۔

آپؒ نے اپنے مکتوبات میں بڑے جوش و خروش اور وثوق و یقین کے ساتھ یہ تبلیغ فرمائی نبیٔ مکرم ﷺ جو کہ محبوب رب العالمین ہیں، ان ﷺ کی اتباع و پیروی کے بغیر نہ تو نجات ممکن ہے، نہ حقیقت تک رسائی اور نہ ہی کمالات و سعادت اخروی کا حصول ہی ممکن ہے۔ تمام بزرگ صوفیہ کی طرح آپؒ اس بات کے قائل ہیں اور اپنے مکتوبات و ملفوظات میں بار بار اس بات کی تاکید و وضاحت فرماتے ہیں کہ شریعت مطہرہ کی پیروی و پابندی لازمی امر ہے۔ اس کے بغیر راہ سلوک یا طریقت و حقیقت تک رسائی یا ممکن نہیں۔ آپؒ مثالیں دے کر یہ بات سمجھاتے ہیں کہ کاملین اولیائے کرام جو درجۂ کمال تک پہنچے ان کا شیوہ کیا تھا۔ انہوں نے سنت رسول اللہ ﷺ اور شریعت مطہرہ کے ادب کو خود پر لازم کیا۔ وہ بزرگ یہ تسلیم کرتے تھے کہ یہ درجات و

(۳۵) منیری، احمد یحیٰ شرف الدین، مکتوبات دوصدی، ۱۱۶-۱۱۷۔

(۳۶) منیری، احمد یحیٰ شرف الدین، مکتوبات دوصدی، ۱۴/ ۱۲۱۔

کمالات ادبِ شریعت و سنت مصطفیٰ ﷺ کے کامل اتباع کا ہی نتیجہ ہیں۔آپؒ کے مطابق سالکینِ راہ احوال و مقامات میں جس قدر ترقی کرتے ہیں۔ ان پر حضور اکرم ﷺ کی محبوبیت اور آپ ﷺ کی کامل اتباع کی اہمیت و ضرورت کا انکشاف ہوتا جاتا ہے۔یوں ان کے لیے یہ بات بدیہی بن جاتی ہے کہ وصول و قرب اور قبولیت آپ ﷺ کے اتباع کامل اور سنت و شریعت میں فنائیت کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کے علاوہ بھی آپؒ کے ملفوظات و مکتوبات سے نصائح و ہدایات کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔ جن سے آپؒ کی تعلیمات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دین و شریعت کے تمام اہم پہلوؤں کا نہایت مختصر،جامع اور خوبصورت طریقے سے تعارف اس طرح کرواتے ہیں:

”خدائی باتیں جو انبیاؑ تک پہنچیں اور آپ حضرات نے اسے قبول کیا ان کا نام وحی دعوت ہے۔جو سنتے ہیں اور اتباع کرتے ہیں ان کو امت کہتے ہیں اور اوامر و نواہی و اصول و فروعِ دعوت کو شریعت کہتے ہیں۔اس راہ میں چلنے کو اطاعت کہتے ہیں۔جملہ احکام پر گردن رکھنے کو اسلام کہتے ہیں۔اسلام پر ثابت قدم رہنے کو دین کہتے ہیں۔غالباً اب تمہیں سمجھ میں آگیا ہو گا کہ شریعت دین کی ایک راہ کا نام ہےجو پیغمبروں کے ذریعے قائم ہوتی ہے “(۳۷)

شریعت اور طریقت کے بارے میں یوں رقم فرماتے ہیں:

”شریعت میں توحید طہارت، نماز، روزہ، حج، جہاد، زکوٰۃ اور دوسرے احکام شرائع و معاملاتِ ضروریہ کا بیان ہے۔طریقت کہتی ہے کہ ان معاملات کی حقیقت دریافت کرو، ان مشروعات کی تہ تک پہنچو،اعمال کو قلبی صفائی سے آراستہ کرو ،اخلاق کو نفسانی کدورتوں سے پاک کرومثلاً ریاکاری، ہوائے نفسانی، ظلم وجفا ،شرک وکفر وغیرہ ہیں۔دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیں کہ ظاہری طہارت و تہذیب سے جس امر کو تعلق ہے وہ شریعت اور تزکیۂ باطن وتصفیۂ قلب سے جسے لگاؤ ہے وہ طریقت ہے۔مثلاً کپڑے دھوکر ایسے پاک بنا لینا کہ پہن کر نماز پڑھ سکیں۔ یہ فعلِ شریعت ہے اور دل کو کدورتِ بشری سے پاک رکھنا فعلِ طریقت،ہر نماز کے لیے وضو شریعت کا کام اور ہر وقت باوضو رہنا طریقت کا دستور العمل ہے،نماز میں قبلہ رو کھڑے ہونا شریعت اور دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہونا طریقت ہے۔حواسِ ظاہری سے جن

(۳۷)منیری،احمد شرف الدین،مکتوبات صدی،۱۹۵-۱۹۶۔

معاملاتِ دینی کا تعلق ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھنا شریعت اور جن معاملاتِ دینی کا تعلق قلب وروح سے ہے ان کی رعایت کرنا طریقت ہے "(۳۸)

تحفہ غیبی میں ہے کہ آپؒ نے مبتدی شاغل کے متعلق فرمایا:

"کبھی روزہ رکھو کبھی نماز پڑھو، اگر نماز میں دل نہ لگے تو ذکر کریں اور اگر ذکر میں دل نہ لگے تو تفکر مراقبہ میں مشغول رہیں۔ اگر ایک چیز سے دل گھبرا جائے تو دوسری کو اختیار کریں کہ انسان ایک چیز کی پابندی سے گھبرا جاتا ہے۔پس کبھی روزہ، کبھی نماز، کبھی تلاوت، کبھی ذکر اور کبھی مراقبہ میں مشغول رہیں کہ مقصود مشغول رہنا ہے "(۳۹)

فوائد رکنی میں اپنے خاص مرید شیخ رکن الدینؒ کو اوراد کی پابندی اور مطالعہ کتب مشائخ کرام پر خاص طور پر یوں تاکید فرماتے ہیں:

"اے بھائی !چاہیئے کہ اپنے اوراد و وظائف کے پابند رہیں اور کسی طرح ان میں کمی اور نقصان نہ ہونے دیں اور مشائخ کرام کی کتب اور ان کے مکتوبات کے مطالعہ سے فارغ نہ رہیں"(۴۰)

آپؒ عشق اور محبت کو طریقت میں بنیاد بلکہ زندگی قرار دیتے ہیں۔ فوائد رکنی میں فائدہ اول میں ہی فرماتے ہیں:

"اے بھائی ! تمہیں معلوم ہو کہ جس طرح ظاہر میں نماز وروزہ فرض ہے اس طرح باطن کے لیے عشق و محبت فرض ہے اور عشق و محبت کا خمیر دردو غم ہے۔ عشق بندے کو خدا تک پہنچاتا ہے۔اسی لیے عشق کو راہ طریقت کے لیے فرض قرار دیا گیا ہے۔عشق زندگی ہے اور عشق نہیں تو موت ہے"(۴۱)

پیروی کیسے شخص کی کرنی چاہیئے اور کسے اپنا راہنما بنانا چاہیئے اس بارے میں فرماتے ہیں:

"اس شخص کے فرمان پر عمل کرنا چاہیے جو علم و عمل سے آراستہ ہو اور بزرگوں کی جماعت کا مسلک اچھی طرح جانتا ہو ۔اس طریقہ کے اصول و فروع کا استاد ہو ۔مشائخین کے کلمات ،ان کی عبارات اور ان کے

---

(۳۸)منیری، احمد، شرف الدین، مکتوبات دوصدی، ۲۵/ ۱۹۶۔

(۳۹) صبیح الحق، ذکر الشرف، ص ۱۴۔

(۴۰)منیری احمد یحیٰ شرف الدین، (س۔ن)، فوائد رکنی، مترجم: ڈاکٹر محمد علی ارشد اشرفی، مکتبہ شرف بیت الشرف۔ فائدہ: ۱۴، ص ۷۵۔

(۴۱)منیری، احمد یحیٰ، شرف الدین، فوائد رکنی، ص ۱۱۔

اشارے اہل سنت و جماعت کے مطابق سمجھتا ہو۔ہر کام کے فوائد ، آفات، مفسدات اعمال و اخلاق، مبتدی ومتوسط اور منتہی کے احوال کو جانے ہوئے ہو"(۴۲)

فوائد رکنی میں ارادت یا مریدی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اے بھائی! مرید وہی ہے جو خود کو اپنے پیر میں گم کر دے۔جانتے ہو ارادت کیا ہے؟(الإرادة ترك الإرادة) یعنی اپنے ارداہ ، خواہش اور اپنی مراد کو ترک کرنا ہی ارادت ہے۔اپنی خواہشات سے اس طرح نکل آئے جس طرح سانپ کینچلی سے باہر آ جاتا ہے۔خود کو پیر کے حوالے یوں کرے جیسے مردہ غسال کے حوالے ہوتا ہے۔اگر مرید کے دل میں ذرہ بھر بھی اعتراض کا پہلو باقی ہے یا چوں چرا کی گنجائش پیدا ہوتی ہے تو ایسا مرید خود پرست ہے پیر پرست نہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ مرید کو پیر پرست ہونا چاہیئے تاکہ کہ وہ خدا پرست ہو جائے (جس نے رسول کی اطاعت کیا اس نے اللہ کی اطاعت کی) یہی تو ہے"(۴۳)

مخالفِ نفس کے بارے میں یوں آگاہ فرماتے ہیں:

"نفسِ کافر کی مخالفت تمام عبادتوں کی سردار ہے۔ پس بقدرِ امکان مرید کو نفس کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ اسے طرح طرح سے بھوکا، پیاسا رکھے، کہ نفسِ کافر کسی چیز سے ایسا نرم ومطیع نہیں ہوتا جتنا کہ بھوک پیاس سے۔ یہ عذاب اسے جہنم کے سات درجوں کے برابر ہے"(۴۴)

غرض آپؒ کا ہر قول اور ہر تحریر تعلیماتِ محمدی ﷺ کا ہی پرتو ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق یہاں آپؒ کے قیمتی ذخیرے سے چند موتی پیش کئے ہیں کہ یہ مختصر مقالہ اس سے زائد کی گنجائش نہیں رکھتا۔

مکتوبات احمد یحیٰ منیریؒ کے اختصاصات

رشتۂ خداوندی اور بندگی کا اظہار مکتوبات کے مضامین پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے مکتوبات کا ایک ہی بنیادی موضوع ہے اور وہ "رشتۂ خداوندی اور بندگی" ہے اور باقی سب مضامین اسی ایک نکتہ کی توضیح و تشریح ہیں۔یعنی بندے کا اپنے الہ و رب سے رشتہ کیا ہے؟بندگی ہے کیا ؟ انسان کی ذمہ داریاں اور

---

(۴۲) صبیح الحق،ذکر الشرف،ص۱۵

(۴۳) صبیح الحق،ذکر الشرف،فائدہ:۱۱،ص۵۷

(۴۴) صبیح الحق،ذکر الشرف،ص۱۵

فرائض کیا ہیں۔بندے کا اپنے پروردگار سے کیا اور کیسا تعلق ہونا چاہیے؟ آپؒ نے یہ باتیں مختلف انداز اور پہلوؤں سے اپنے مکتوبات میں ظاہر فرمائی ہیں۔

فاصلاتی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ

آپؒ کے عہد میں مکتوبات کو اہم موضوعات کے اظہار کو باقاعدہ ذریعہ نہیں بنایا جاتا تھا۔مکتوبات صرف خیر یت کی اطلاع اور حالات و حاجات کے بیان تک ہی محدود تھے۔آپ ؒ نے انہیں ایک مستقل فن بنا دیا۔ ایسے مضامین جو مستقل طور پر ایک ایک کتاب میں سموئے جا سکتے ہیں انہیں چھوٹے چھوٹے مضامین میں لکھااور ساتویں و آٹھویں صدی ہجری میں فاصلاتی تعلیم کا عملی تصور پیش کیا ۔

بزرگان دین کی کتب کا تعارف اور ان کی وضاحت

آپؒ نے ہی ہندوستان میں سب سے پہلے حضرات امام احمد غذالیؒ، امام محمد غزالیؒ، عین القضاۃ ہمدانیؒ، ابنِ عربیؒ خواجہ فرید الدین عطارؒ، شیخ فخر الدین عراقیؒ اور مولانا جلال الدین رومیؒ جیسے موحدین علماؒ اور صاحبان حقیقت کو متعارف کروایا ان کی تعلیمات کو عام کیااور ان کی تشریح و توضیح فرما کر ان تعلیمات کو ہندوستان میں کو صحیح مقام عطا فرمایا ۔مخدوم شعیب فردوسی اپنی تالیف ”مناقب الاصفیاؒ“ میں لکھتے ہیں کہ:

> ”در ہند کسی کلمات این بزرگان مطالعہ نکردی واگر مطالعہ کردی مقصود این بزرگان در نیافتی، در ملفوظ مشایخ ہند ذکر کلمات این بزرگان کمتر افتادہ است بلکہ بعضے از مشایخ ہند بر بعضے این بزرگان بر طریق طعنہ چیزی گفتہ اند “(۴۵)

(ہندوستان میں ان بزرگوں کے کلمات کا مطالعہ کسی نے نہیں کیا تھا۔ اگر کسی نے کیا بھی تھا تو ان بزرگوں کے مقاصد تک رسائی نہیں ہوئی تھی۔یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے دیگر مشائخ کرامؒ کے ملفوظات میں ان بزرگوں کے کلمات کا حوالہ بہت کم ملتا ہےبلکہ ہندوستان کے بعض مشائخ نے ان بزرگوں پر طعنہ زنی بھی کی ہے)

فوائد رکنی کے چودھویں فائدے میں بزرگان دین کی تحاریر روزانہ پڑھنے کی تاکید فرماتے ہیں اور پھر ایک بزرگ کے حوالے سے اس کی اہمیت یوں بیان فرماتے ہیں کہ ان بزرگوں کی کتب اور ان کے کلمات

(۴۵)فردوسی، شاہ شعیب، (س۔ن)، مناقب الاصفیاء، مطبع نور الآفاق، کلکتہ، انڈیا۔ ص۱۲۷۔

روئے زمین پر خدائی لشکر ہیں۔انہیں پڑھنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والا مرد ہو گا تو شیر مرد بن جائے گا۔اگر نامرد ہو گا تو مرد بن جائے گا۔کسی دوسرے بزرگ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ اگر بزرگانِ دین دنیا میں نایاب ہو جائیں تو بزرگوں کی کتابوں کا ایک جزو روزانہ پڑھ لیا کریں۔کہ زندگی وہی ہے جو ان بزرگوں کے سایۂ دولت تلے گزاری جائے۔(۴۶)

مکتوب الیہم سے بے پناہ ذاتی لگاؤ

آپؒ نے کتوبات میں اپنے مکتوب الیہم کو جیسے القاب دیے ہیں ، اور جیسے ان کو مکتوبات کے اندر خطاب فرمایا ہے ان سے آپؒ کی طبیعت میں عاجزی و فروتنی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مخاطب کو جیسے ان کے علم و مرتبہ کو مد نظر رکھ کر ان کا اکرام فرمایا ہے جیسے انہیں عزت و شرف سے نوازا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل میں ان کے لیے کس طرح کے جذبات موجزن ہیں۔ آپؒ نے انہیں برادراعز،عزیز الوجود، فرزنداعز، امام، مولانا، یارِ قدیم ،صدر العلمأ و مولانا وغیرہ لکھے ہیں۔ یہ طرزِ تخاطب آپؒ کے بے پناہ قلبی لگاؤ اور ذاتی تعلقات کا بخوبی اظہار کرتے ہیں۔خصوصاً آپؒ نے حضرت مظفر بلخیؒ اور قاضی شمس الدینؒ کو زیادہ مکتوبات لکھے ہیں۔ ان سے اپنے قلبی تعلق کے بارے میں خود وضاحت فرمائی ۔ حضرت مظفر بلخیؒ کو اپنا جسم و جان تک قرار دیا، فرماتے ہیں:

"تن مظفر جان شرف الدین، جان مظفر تن شرف الدین، شرف الدین مظفر، مظفر شرف الدین"(۴۷)

آپؒ قاضی شمس الدین کو بھی خوب عزیز رکھتے تھے اور انہیں ہی زیادہ مکتوبات تحریر فرمائے۔وصال کے وقت جہاں اوروں پر نوازشیں فرمائیں وہاں قاضی صاحب کو بلا یا اور فرمایا کہ قاضی شمس الدین کو کیا کہوں!یہ تو میرے فرزند ہیں ۔ اکثر میں نے ان کو فرزند اور کبھی برادر لکھا ہے۔انہی کی وجہ سے میرا علمِ درویشی ظاہر ہوا اور مجھے لکھنا اور کہنا پڑا ورنہ کون لکھتا۔ فوائد رکنی کے ہر فائدے میں بھی مکتوب الیہ کو بار بار اے بھائی !کہہ کر مخاطب فرمایا ہے۔

منتخب موضوعات پر مکتوب

آپؒ کے عہد میں مکتوبات کو اہم موضوعات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا جاتا تھا۔مکتوبات صرف خیریت ،خیالات اور حاجات کے بیان تک ہی محدود تھے۔مگر آپؒ نے مکتوبات کو ایک مستقل فن بنا دیا ۔جو مضامین مستقل

---

(۴۶)منیری، احمد یحیٰ شرف الدین، فوائد رکنی، فائدہ:۱۴، ص۷۵

(۴۷)منیری، شرف الدین، مکتوباتِ صدی، ص ۳۰۔

طور پر ایک ایک کتاب میں سموئے جا سکتے تھے۔انہیں چھوٹے چھوٹے مکتوبات میں لکھ کر عام کر دیا۔ آپ کے مکتوبات دینی،اخلاقی اور صوفیانہ تمام اہم مضامین پر مشتمل ہیں اور معلومات کے نہایت وسیع ذخیرے کو لیے ہوئے ہیں۔

سخت معاملات پر امید دلانا، ہمت بندھانا اور مکتوب الیہ کو عمل کی طرف راغب فرمانا آپؒ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ صمدیت و استغناءً اس کا اختیار مطلق ،اس کی قدرتِ کاملہ ، جباری و قہاری کا بے مثال بیان فرماتے ہیں۔ پھر آخرت کے ایسے احوال بھی کہ پڑھ کر انسان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ حیرت نہیں کہ ایک صاحبِ یقین و نظر کی تحریر جسے اظہار کی بڑی قوت عطا ہوئی ہو ،اسے پڑھ کر قاری پر مایوسی طاری ہو جائے۔ اسے اپنی تباہی و بربادی یوں نظر آئے کہ نجات کی کوئی امید باقی نہ رہے۔مگر علمائے ربانی اور نائبین رسالت مآب ﷺ ان کی بشارت وانذار دونوں کا عمدہ نمونہ ہوتے ہیں ۔وہ بندگانِ خدا کو نبی کریم ﷺ کی امت کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں کرتے ۔ صرف راہ حق کی مشکلات ہی نہیں دکھاتے۔ انہیں اللہ کے بے پایاں فضل کی طرف لے کر جاتے ہیں۔اس کا رستہ دکھاتے ہیں۔ ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ عمل اور کوشش کرنے پر آمادہ کرتے ہیں کی جو بعثتِ انبیائے کرام اور ان کے ورثاؑ کی دعوت اور جدوجہد کا مقصود ہوتا ہے۔ اس کا کامل نمونہ ہمیں حضرت مخدومِ جہاںؒ کی تحریروں میں نظر آتا ہے کہ جہاں آپؒ جلالِ خداوندی کے ساتھ اس کے جمال کا مشاہدہ بھی کرواتے ہیں۔ اس کی شانِ قہاری کے بعد شانِ غفاری کی جھلک بھی بڑی وضاحت سے دکھلاتے ہیں۔ مشکل و مہیب مقامات و معاملات دکھا کر قاری کی توجہ پھر اس ارحم الراحمین کی طرف مبذول کرواتے ہیں،اس کے فضل و کرم کی یاد دہانی کرواتے ہیں اور اسے عمل پر آمادہ فرماتے ہیں۔ اس کی امید کو ٹوٹنے نہیں دیتے،ہمت بندھاتے ہیں۔ طلب اور کوشش کی طرف راغب کرتے ہیں ۔

علمائے کرام، قضاۃ ، امراء اور شاہان وقت ،مکتوب الیہم کا وسیع دائرہ آپؒ کے مکتوب الیہم کی جانب دیکھا جائے تو یہ ایک لمبی فہرست بنتی ہے۔جن میں آپؒ کے تلامذہ و مریدین اور خلفاؑ کے علاوہ علمائے کرام، امرا، قضاۃ بلکہ خود شاہانِ وقت تک شامل ہیں۔ آپ نے اسلامی معاشرے کے تمام اہم ارکان و عناصر کو مکتوبات رقم فرمائے اور انہیں حسب حال ہدایت و نصائح سے نوازااور اپنی معلومات، علم شریعت، فہم دین، بزرگان دین کے علوم و فنون سے آگاہ فرمایا۔

آپؒ نے بادشاہوں سے کوئی ذاتی تعلق و واسطہ نہ ہونے کے باوجود محمد شاہ تغلق اور فیروز شاہ تغلق کو نصحیت و ہدایت کے لیے مکتوب بھیجے۔ سلطان محمد تغلق کو ایک مکتوب لکھا جس میں اسے اپنے کاموں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے اور اپنے علم کو ایک کنارے رکھ دینے کا بیان تھا۔اس میں بتایا کہ جب تک (کئی) لوگوں

کے پاس دولت نہیں آئی اور ان کی (اکثر) مرادیں پوری نہیں ہوئیں وہ ذات باری تعالیٰ سے منہ موڑنے والے نہ بنے۔ مثلاً ثعلبہ (صحابی) جسے کبوتر مسجد کہا جاتا تھا۔جب دولت آئی تو اسلام سے ہی پھر گیااور فرعون، نمرود، شداد اور عاد جب تک نامراد رہے کسی نے خدائی دعویٰ نہ کیا مگر جب بامراد ہوئے تو خدائی دعویٰ کرنے لگے۔(۴۸) اسی طرح آپؒ نے فیروز شاہ تغلق کو بھی ایک مکتوب لکھا جس میں نہایت بلیغ پیرایہ اور عالمانہ انداز میں اسے عدل و انصاف کی تلقین کی ہے۔جس بہت سی احادیث مبارکہ سے استشہاد کیا ہے۔(۴۹)

آپؒ نے سلطان محمد تغلق اور سلطان فیروز شاہ تغلق کے علاوہ جن سیاسی و حکومتی شخصیات کو مکاتیب لکھے ان میں داؤدملک (داماد سلطان محمد تغلق) قاضی شمس الدین (قاضی ٔچوسہ)، قاضی صدر الدین (نائب قاضی سنار گاؤں)، قاضی زاہد، قاضی حسام الدین، خواجہ مہذب،خواجہ احمد ،امین خان ،ملک زادہ مبارک قصوری، ملک خضر ،ملک مفرح ،ملک محمود ملک معزالدین، شمس الملک، شمس الدین خوارزمی، ملک الامراء جیسے اہم حکومتی مراتب پر فائز لوگ شامل ہیں۔سب سے زیادہ اور اہم ترین مکتوبات قاضی شمس الدین کے نام ہیں۔عرفان و تصوف سے متعلق کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کی وضاحت آپؒ نے ان مکاتیب میں نہ کی ہو۔بالا درج دیگر سیاسی عمائدین کو بھی آپؒ نے کئی مکاتیب لکھے ،جن میں اپنے عالمانہ وقار اور سنجیدگی سے نصیحتیں کیں۔ ان کو دین اسلام کے بارے میں صحیح آگاہی بخشی۔ عقائد کی تصحیح فرمائی اور اعمال حسنہ کی طرف راغب کیا۔

انقلاب انگیز دعوت

تحاریر میں مؤثر ترین اجزا ٔمیں انسانی مقام و مرتبے، قلب انسانی کی وسعت و رفعت ،انسانی صلاحیتوں ،ان میں ترقی کے امکانات،عشق ومحبت اور ان کی قدر و قیمت پر لکھا گیا ہے۔ ان موضوعات پر نظم کی صورت میں تو ہمارے کئی بزرگوں نے لکھا ہے۔مگر جہاں تک نثر کا تعلق ہے اس میں حضرت مخدوم جہاںؒ کے مکتوبات کو بے حد قوی، بلیغ اور مؤثر تسلیم کیا گیا ہے۔ان کے مطالعے سے دل میں اعتماد، حوصلہ، ہمت، جرأت، امید ،لگن اوران کمالات کو حاصل کرنے کی امنگ بیدار ہوتی ہے۔جو انسان کے لیے رکھے گئے ہیں۔ انسان کی یاس و ناامیدی ، کم حوصلگی ، بے اعتمادی ،افسردگی اور شرمندگی کا ازالہ ہوتا ہے ۔یہ مکتوبات انسان میں طلب ، عمل اور کوشش کو پیدا کرکے منزل کی جانب سفر کو آسان بناتے ہیں۔یہ کہنا بعید نہ ہو گا کہ یہ مکتوبات ایک انقلاب انگیز دعوت کے لحاظ سے لکھے گئے ہیں۔

---

(۴۸) شرف الدین احمد، (۱۴۲۴ھ)، مکتوبات دوصدی، مترجم: شاہ قسیم الدین، سیرت فاؤنڈیشن، لاہور، پاکستان۔ ص ۶۷۴۔

(۴۹) شرف الدین احمد یحیٰ، مکتوبات دوصدی، ص ۳۸۴-۳۸۶۔

کرامت وشرف انسانی کی یاد دہانی

خود شکنی وخود عاری کے بعض ناعاقبت اندیش مبلغین کی وجہ سے یہ بات عام ہو رہی تھی کہ انسانیت ننگ وعارایک ناقابلِ اصلاح فطری عیب اور ناقابل تلافی تقصیر ہے۔ انسانی ترقی میں خود انسانیت ہی سب سے بڑھ کر رکاوٹ اور سدِراہ ہے۔جسے دور کرنا انسان کے لیے سب سے ضروری ہے کیونکہ انسان کا وجود خود ایسا گناہ ہے کہ جس کے برابر کوئی گناہ نہیں۔ جس کے نتیجے میں انسان خود مسجود ملائک ہوتے ہوئے فرشتوں پر رشک کرتے ہوئے خود میں انسانی کمالات وصفات کو جلا دینے اور بہتر بنانے کی بجائے خود میں ملکوتی صفات پیدا کرنے اور فرشتوں کی تقلید کا خواہاں ہونے لگا تھا۔ اس فضا میں حضرت مخدومؒ جہاںؒ نے ایک نامانوس آواز بلند کی اور بڑی حکمت ،بلاغت اور سہولت کے ساتھ انسانی رفعت ، محبوبیت اور اس کے خلیفۃ اللہ ہونے کے منصب کی یاد دہانی کروائی۔اور پھر اسے اپنے مکتوبات میں اس طرح باربار دہرایا اور مختلف اسلوب و طریقوں سے سمجھایا کہ اسے جمع کیا جائے تو اس موضوع پر ایسا قیمتی ذخیرہ بن جائے جسے پڑھ کر انسان کا دل حوصلے،امنگ اور ولولے سے معمور ہو جائےاور وہ دوسری کسی بھی مخلوق کی بجائے خود کو انسان ہونے پر ناز کرنے لگے۔ مثلاً مکتوبات صدی کے اڑتیسویں مکتوب میں لکھتے ہیں:

"دیکھو! موجودات بہت تھیں۔مصنوعات بے شمار تھیں مگر کسی ایک کے ساتھ یہ معاملہ نہیں جو اس آب و گل (انسان) کے ساتھ ہے"(۵۰)

انسان کو سرِ الٰہی کا حامل قرار دیتے ہوئے اس بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ ہزار عالموں میں کسی کو بھی انسان سے زیادہ بڑھ کر ہمت والا پیدا نہیں فرمایااور انسانوں کے علاوہ اور کسی کے لیے (نفخت فيه روحي) یعنی اس میں میں نے اپنی طرف سے روح پھونکی) نہیں فرمایا۔اس کے علاوہ اور کسی گروہ میں انبیاؑ اور آسمانی کتابیں نہیں بھیجی گئیں ۔روزِ ازل سے سوائے آدمیوں کے کسی پر سلام نہیں کیا گیااور سوائے ان کے اور کسی کو دیدار کی دولت کسی کو عطا نہیں ہوئی"(۵۱)

انسان میں محبت کی امانت ودیعت ہونے کا یوں ذکر فرماتے ہیں:

---

(۵۰)شرف الدین یحیٰ منیری، مکتوبات صدی، ص۲۷۱۔

(۵۱)ایضاً، ۵۳/ ۳۵۴۔

"دوسری مخلوقات کو محبت سے کوئی لگاؤ نہیں کہ وہ بلند ہمت نہیں رکھتی۔ملائکہ کاکام جو سیدھ میں چل رہا ہے اسی لیے کہ ان تک محبت کا گزر نہیں ہوا۔اور یہ جو اونچ نیچ انسانوں کے ساتھ پیش آتی ہے حدیث محبت بمصداق(وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ ان سے محبت کرتا ہے) انہیں محبت سے سروکار ہے۔ پس جس کے مشامِ جاں تک محبت کی کچھ خوشبو پہنچی اسے چاہیے کہ سلامتی کو خیر باد کہے اور خود کو بھی وداع کردے کی محبت(جب ہو جائے تو) کسی چیز کچھ نہیں چھوڑتی اور نہ کچھ باقی نہیں رہنے دیتی ہے"(۵۲)

فارسی ادب کے شاہکار مکتوب

ان میں ایک خاص ادبی چاشنی موجود ہے۔طویل جملوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے فقرے بھی عجیب بہار دکھاتے ہیں ۔ آپؒ نے ان مکتوبات میں عربی و فارسی مثالوں، مقولوں اور شعروں کا خوب استعمال کیا ہے۔ اس بارے میں مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ :

"دینی و علمی برتریاں جو حضرت مخدوم کو بارگاہ ربانی سے ارزانی فرمائی گئی ہیں،ان سے تو دنیا واقف ہے لیکن کم از کم میرا خیال تو یہی ہے کہ نثر نگاری میں سعدی شیرازی کے بعد کسی کا نام ہند میں ہی نہیں بلکہ ایران میں بھی اگر لیا جا سکتا ہے تو شاید وہ بہار کے مخدوم الملک ہی ہو سکتے ہیں۔مکتوبات کی شکل میں (آپؒ نے) جو ارقام فرمایا ہے فارسی زبان میں اس کی نظیر نہیں ملتی"(۵۳)

ابوالحسن ندوی تاریخ دعوت و عزیمت کی تیسری جلد میں حضرت مخدومِ جہاں کے تذکرہ میں آپؒ کے مکتوبات کا بارے میں لکھتے ہیں:

" آپ کی باطنی کیفیات،یقین و مشاہدہ دعوت کے غلبہ ،اہلِ عصر و اہل تعلق کو حقائق سے آگاہ کرنے اور(انہیں) منزلِ مقصود پر پہنچانے کے جذبہ، اخلاص و درد مندی، روح کی لطافت، اور قلب کی پاکیزگی اور اس سب کے ساتھ زبان پر قدرت نے حضرت شیخ شرف الدینؒ کو ایک بلند ادبی مقام عطا کیا ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کے لیے ایک مستقل اسلوب پیدا کر لیا ہے جو انہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ان کے مکتوبات نہ صرف فارسی ادبیات بلکہ اسلامی ادبیات میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور معارف و

---

(۵۲)ایضاً،۴۶/۳۱۹۔

(۵۳)شرف الدین یحیی منیری،مکتوبات صدی، ص ۱۳۱۔

حقائق، دعوت و اصلاح کے وسیع ذخیرے میں کم چیزیں ایسی ہوں گی جو اپنی ادبیت اور قوت تاثیر میں ان کی نظیر ہوں"(۵۴)

خلاصہ کلام:

غرض حضرت مخدومِ جہاں نے نہ صرف ملکِ ہند کے باشندوں کو حق تعالیٰ کے رستے سے روشناس کروایا، بندوں کا رب سے تعلق اور اس کی ضرورت و اہمیت کو واضح کیا، بے شمار لوگوں کے دلوں میں حبِ الٰہی اور حق طلبی کا جذبہ بیدار فرمایا، انہیں سلوک و معرفت کے لطیف عالی علوم سے بہرہ مند فرمایا بلکہ دوسرے مصلحین امت اور بزرگان دین کی مانند انہوں نے دین کی حفاظت کا فریضہ بھی بخوبی سر انجام دیا۔ آپؒ نے عقائد و احکام یعنی شریعتِ اسلامی کو غالی و جاہل بزعمِ خود صوفیاً کی بے اعتدالیوں، ملحدین کی تحریفات اور باطنیت و زندقہ کے اثراتِ بد سے محفوظ رکھا اور ان غلط اعتقادات کی نشاندہی فرمائی جو بد اعتقاد مبلغین و مصلحین، جاہل مشائخ اور فلسفہ و باطنیت سے متاثر اشراقین کی دعوت و تبلیغ سے شرقی ہندوستان جیسے دور افتادہ علاقوں میں (کہ جہاں اسلام بہت گھوم کر پہنچا تھا اور وہاں کتاب و سنت سے براہ راست معلومات کے ذرائع آغاز سے ہی محدود رہے تھے) سحر طاری کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے مکتوبات کے ذریعے ان سب باطل و غلط عقائد اور خیالات پر کاری ضرب لگائی اور ان کے نتیجے میں پھیلنے والے زندقہ و الحاد اور عقائدِ اسلامیہ کے تزلزل کو روک کر عقائدِ صحیحہ اور اہلِ سنت کے درست مسلک کی تبلیغ و اشاعت بڑے موئژ، قوی اور بھرپور طریقے سے کی۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بارے میں درست اور صحیح متعارف کروایا اور سب کو اللہ و اس کے مکرم و حبیب رسول ﷺ کے رستے کی طرف لے کر آئے۔

سفارشات

آج آپؒ کی عظیم شخصیت کی طرح آپؒ کا عظیم کام بھی عوام کیا علماً کی نظر سے اوجھل ہے۔ علمائے کرام تک آپؒ کی شخصیت سے ناواقف ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپؒ کی سوانح حیات اور تعلیمات کو خصوصاً یونیورسٹی کی سطح پر نصاب میں شامل کیا جائے۔ آپؒ کے مکتوبات جو شریعت و تصوف کے حوالے سے اسلامی تاریخ کا بہترین سرمایہ و ذخیرہ ہیں۔ اگر انہیں جدید پیمانوں کے مطابق تخریج و تشریح کے ساتھ شائع کروانے کا انتظام کیا جائے تو معاشرے کے لیے نہایت کار آمد اور بہت فائدہ ثابت ہوگا۔ اس مقصد کے لیے آپؒ کے مکتوبات،

---

(۵۴) ندوی، ابوالحسن علی، تاریخ دعوت و عزیمت، ۳/۲۴۵۔

ملفوظات اور دیگر تصانیف کو موضوع تحقیق بناکر ان پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی مقالے لکھوائے جا سکتے ہیں۔ تعلیم وابلاغ کے جدید ذرائع یعنی الیکٹریک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے پروگرام مرتب کر کے عوام تک آپؒ کی تعلیمات پہنچائی جا سکتی ہیں۔ان کے علاوہ مختلف سطحوں پر سیمیناروں اور کانفریس کو منعقد کروا کر علمأ اور پڑھے لکھے طبقے میں بھی آپؒ کی شخصیت اور تعلیمات کو سامنے لایا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

۱. القرآن الکریم

۲. دہلوی، عبدالحق محدث، (۲۰۱۵ء)، اخبار الاخیار مع مکتوبات، النوریہ رضویہ پبلشنگ کمپنی، لاہور

۳. شرف الدین احمد، (۱۴۲۴ھ)، مکتوبات دوصدی، مترجم: شاہ قسیم الدین، سیرت فاؤنڈیشن، لاہور، پاکستان

۴. صبیح الحق، شاہ، (۱۹۴۱ء)، ذکر الشرف، نظامی پریس، بدایوں

۵. عبدالرحمٰن، صباح الدین، (س۔ن)، تذکرہ اولیائے کرام، دار المصنفین شبلی اکیڈیمی، اعظم گڑھ، انڈیا

۶. فردوسی، زین بدر، (س۔ن)، عربی۔ معدن المعانی۔ ملفوظات: حضرت احمد یحیٰ منیری، مطبع شرف الاخبار

۷. فردوسی، شیخ احمد لنگر دریا، (۲۰۱۰ء)، مونس القلوب، مترجم: ڈاکٹر محمد علی ارشد شرفی، بہار (نالندہ)، مکتبۂ الشرف

۸. محب الرسول، محمد، شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری، (دینی خدمات اور انکے اثرات و نتائج)، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل

۹. منیری، احمد یحیٰ، (۱۳۹۶ھ)، مکتوبات صدی، مترجم: سید نجم الدین احمد فردوسی و سید الیاس، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی

۱۰. منیری، احمد، شرف الدین، مکتوباتِ صدی، مقدمہ: محمد نعیم ندوی

۱۱. محمد اکرام، (۱۹۸۷ء)، آبِ کوثر، تاج کمپنی، ترکمان گیٹ، دہلی، انڈیا

۱۲. منیری، احمد یحیٰ شرف الدین، (۲۰۰۳ء)، مکتوبات دوصدی، مترجم: شاہ قسیم الدین، سیرت فاؤنڈیشن، لاہور

۱۳. منیری احمد یحیٰ شرف الدین، (س۔ن)، فوائد رکنی، مترجم: ڈاکٹر محمد علی ارشد اشرفی، مکتبہ شرف بیت الشرف

۱۴. فردوسی، شاہ شعیب، (س۔ن)، مناقب الاصفیاء، مطبع نور الآفاق، کلکتہ، انڈیا

۱۵. ندوی، ابوالحسن علی، (۲۰۱۰ء)، تاریخ دعوت وعزیمت، مجلس تحقیقات نشریات اسلام، لکھنؤ، انڈیا

۱۶. ندوی، ابوالحسن، (س۔ن)، تاریخ دعوت وعزیمت، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی

ملزم پر جسمانی تشدد قانونی و شرعی تناظر میں

The legal and Islamic perspective of the use of violence against an accused

☆سید عزیز

☆☆ ڈاکٹر طاہر مسعود قاضی

ABSTRACT

This research paper is based on the legitimacy and illegitimacy of physical violence against the accused in a legal and Shariah context. Nowadays, the accused is subjected to mental and physical violence for various reasons. Investigative agencies, especially the police tries to obtain confessions and other required information like evidence by torturing the accused. Are confessions or testimonies based on physical violence admissible in a legal and Shariah context? Can a case be decided by getting a statement of one's own accord from the accused due to physical and mental torture? An attempt has been made to research the relevant issues in the under review article.

Keywords: Violence, Legal, Shariah, Law.

ملزم وہ شخص ہوتا ہے جس پر محض کسی جرم کے ارتکاب کا الزام ہو۔ یہ الزام غلط بھی ہو سکتا ہے اور درست بھی اس کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے تفتیش کا عمل اشد ضروری ہے۔ پاکستان میں تفتیش کرنے کا اختیار بالخصوص فوجداری مقدمات میں پولیس کے پاس ہوتا ہے۔ پولیس ملزم کو پکڑتی ہے اور جرم کا سراغ لگانے میں سرگرم عمل ہوتی ہے۔ ملزم کو پکڑنے بعد پولیس تفتیش کا عمل شروع کرتی ہے۔ تفتیش کا اصل مقصد جرم سے متعلق شہادت کا حصول ہے پولیس اس مقصد کو پورا کرنے میں ملزم کو مختلف ذہنی اور جسمانی آزمائش سے گزارتی ہے۔ ایسی ذہنی یا جسمانی آزمائش جس میں ملزم پر کاری ضرب لگائی جائے یا ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں ملزم ذہنی طور پر مفلوج ہو جائے اس طرز عمل کو تشدد کا نام دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں مروج طریقہ تفتیش، بالخصوص پولیس کے تفتیشی اداروں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اقرار جرم یا دیگر قسم کی شہادت کے حصول کے لیے ملزم پر تشدد کیا جاتا ہے۔ یہ تشدد اس قدر سخت ہوتا ہے کہ بعض اوقات دوران تفتیش ملزم کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس پر قانون نافذ کرنے والے اداروں کی خاموشی اور

☆ پی۔ایچ۔ڈی اسکالر، یونیورسٹی آف لاہور

☆☆ چیئرمین شعبہ اسلامک سٹڈی، گیریژن یونیورسٹی، لاہور

حکومت کے علم میں ہونے کے باوجود کوئی خاطر خواہ رد عمل ظاہر نہیں کیا جاتا جس سے عوام الناس میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ تفتیشی اداروں کا ملزم پر اس طرح ظلم و تشدد روا رکھنا شاید آئینی اور قانونی ہے۔ زیر نظر آرٹیکل میں اسی عقدہ کو رائج الوقت قانون اور شریعت اسلامیہ کے تناظر میں مختصر مگر جامع انداز میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبال جرم کے حصول کے لیے جسمانی تشدد

اقبال / اقرار جرم سے مراد کسی شخص کا اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو مکمل طور پر یا جزوی طور پر تسلیم کر لینا کہ وہ اس جرم میں اس حد تک شریک ہوا ہے یا جرم اس سے سرزد ہوا ہے اقبال جرم / اقرار جرم کہلاتا ہے ۔ یہ اقرار تحریری ، تقریری یا اشاری کسی بھی صورت میں ہوسکتا ہے ۔پاکستان کے رائج قانون میں اقرار جرم کو Confession کہتے ہیں جس کا مطلب اقبال جرم ہے۔ قانون شہادت کے آرٹیکل 37,38,39 میں اقرار جرم کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ قانونی لغات میں اقبال جرم کی وضاحت کچھ اس طرح کی جاتی ہے۔

CONFESSION:

> "In criminal law. A voluntary statement made by a person charged with the commission of a crime or misdemeanor, communicated to another person, wherein he acknowledges himself to be guilty of the offense charged, and discloses the circumstances of the act or the share and participation which he had in it"(1)

کسی شخص کی مرضی پر مبنی ایسا بیان جو اس کو مجرم یا خطاکار ثابت کرے ، وہ تمام حالات، مشترکات اور خصوصیات جو اس فعل سے متعلق ہوں، جن کا وہ مرتکب ہوا ہو، کسی ایسے دوسرے شخص کو بتائے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ اپنے خلاف جرم ثابت کر رہا ہے، اقبال کہلائے گا۔

پاکستان کے قانون مجموعہ ضابطہ فوجداری میں اس کی وضاحت دفعہ نمبر ۱۶۴ میں کی گئی ہے اور اس کا طریقہ بھی وضع کیا گیا ہے۔ مذکورہ دفعہ کے مطابق اقبال جرم کا بغیر جبر و اکراہ کے ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ پولیس کی حراست میں لیا گیا ہے تو قابل ادخال شہادت نہ ہوگا۔ نیز اس اعتراف میں عدالت ملزم کو مکمل طور پر ایسا ماحول دے گی جس کی بنا پر وہ اپنے اوپر کسی بھی خوف کو محسوس نہ کرے۔

---

(1) Featuring Black's Law Dictionary Free Online Legal Dictionary 2nd Ed

اقبال جرم اور اس کی صورتیں: Admission/ Confession

ملزم جب اقرار جرم کرلیتا ہے تو بادی النظر میں مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی اور مقدمہ میں تفتیش کے طویل طریقہ کار کا اختتام ہو جاتا اور ملزم شخص مجرم کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ فوجداری مقدمات میں اقبال جرم کی دو صورتیں ہیں۔

- عدالتی اقرار جرم Judicial Confession
- غیر عدالتی / زائد اقرار جرم Extra Judicial Confesstion

ان دونوں صورتوں میں ملزم کا اقبال جرم دیکھا جاتا ہے کہ وہ اس کے خلاف بطور شہادت قابل قبول ہے یا نہیں۔ ہر دو صورتوں میں قانون نے اس کی وضاحت کی ہے کہ کون سا اقبال کس کیفیت اور کس حیثیت میں قابل ادخال شہادت ہو گا۔

عدالتی اقرار جرم: Judicial Confession

عدالتی اقرار جرم سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی ملزم نے اپنا اقبال جرم کسی مجسٹریٹ درجہ اول یا مجسٹریٹ درجہ دوم جس کو صوبہ کی حکومت نے خاص طور پر یہ اختیار دیا ہو، اس کے سامنے کیا ہو اور جس کو اقبال جرم لینے والے کی ہدایات پر مطلوبہ شرائط کے ساتھ رقم کیا گیا ہو تو اس کو عدالتی اقبال کہتے ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اقبال جرم لینے والے مقتدرین میں سے پولیس افسر کو دفعہ نمبر ۱۶۴ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت خارج کر دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں پولیس کا کوئی افسر اعتراف جرم اگر کروائے تو اس کو من و عن قانوناً تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ قانون میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ اگر کسی ملزم کا وہ بیان جو کسی عدالت میں اس طرح لیا گیا ہو جس میں کسی قسم کے جبر واکراہ کا کوئی شائبہ بھی نہ ہو اور ملزم اپنے اعتراف کو بغیر دباؤ کے بیان کرے اس بیان کو بطور اقبال جرم تحریر کیا جائے گا اور یہ قبل ادخال شہادت ہو گا۔[1]

معلوم ہوا کہ جس خدشہ کے تحت پولیس کی حراست میں ملزم کے اقرار جرم کو ناقابل ادخال شہادت قرار دیا گیا ہے اس میں اصل علت تشدد، دباؤ، دھمکی وغیرہ کا ہونا ہے۔ قانون کے سامنے جتنے بھی وثوق سے یہ بات کی جائے کہ ملزم سے جو اقرار لیا گیا ہے وہ اس کی مرضی سے ہے پھر بھی اس اقرار جرم کو قابل ادخال شہادت قرار نہیں دیا جاسکتا

---

(1) Major Act 2007, A Publication of PLJ Committee,Punjab Bar Council, 9-fane Road, Lahore,P:395

ہے یہاں تک کہ مجسٹریٹ ملزم پر جب تک یہ واضح نہیں کر دیتا کہ اس کے اقرار جرم پر اسے کس قسم کی سزا جھیلنا پڑے گی اس وقت تک مجسٹریٹ کے سامنے لیا گیا بیان بھی درست نہیں کہلاتا اور اگر اقرار جرم کے لیے ملزم کو بالکل آزادانہ ماحول مہیا نہیں کرتا تو بھی یہ اقرار قانوناً قابل ادخال شہادت نہیں۔

غیر عدالتی / زائد اقبال جرم: Extra Judicial Confesstion

اگر کسی ملزم نے عدالت کے علاوہ کسی جگہ اپنا اقبال جرم کیا تو اس کو غیر عدالتی بیان کہا جاتا ہے۔[۱] دوسرے الفاظ میں ایسا اعتراف جو عدالت یا کسی مقتدر شخصیت جو تفتیش و تحقیق کے لئے قانونی اختیار رکھتی ہو اس کے علاوہ کسی ایسے شخص کے سامنے ہو جس کو قانوناً ایسا کوئی بھی اختیار حاصل نہ ہو کہ وہ اعتراف جرم کو محفوظ کرے، اس کے سامنے کیا ہوا اقبال جرم بھی بطور شہادت تسلیم نہ ہو گا۔[۲]

عدالت نے غیر عدالتی اقبال جرم کو پیش کرنے کے ساتھ انتہائی احتیاط برتی ہے۔ کیونکہ عدالت کی نظر میں کوئی بھی شخص اپنے جرم پر کسی کو گواہ نہیں بناتا۔ تاہم اگر کسی کا اقبال جرم کسی شخص کے سامنے ہوا ہے تو اس کے لئے تمام مواد اور ملزم سے متعلقہ حالات واقعات کو مد نظر رکھا جائے گا۔[۳]

اقبالی بیان کی صورت:

قانون شہادت کے آرٹیکل ۳۷ میں اقرار جرم کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ فوجداری مقدمات میں ملزم کے اقرار جرم کی صورت اگر اس طرح کی ہے کہ جس میں ملزم کو کسی ترغیب، دھمکی یا وعدہ کی بنا پر کوئی اقرار کروایا گیا ہے تو اس اقبال جرم کو قانونی طور پر غیر مؤثر اور ناقابل ادخال شہادت قرار دیا گیا ہے۔ مذکورہ آرٹیکل میں تین صورتوں کا ذکر ہوا ہے کہ اگر ان میں سے کسی بھی صورت میں اقبال جرم ہوا ہو گا تو قبول نہ کیا جائے گا۔

اگر کسی ملزم کو کسی بھی دھمکی تشدد یا ترغیب کے ضمن میں کوئی اقبالی بیان دلوایا جائے خواہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے ہی اقبال کیوں نہ ہو وہ قابل قبول نہ ہو گا۔ اسی وجہ سے مجسٹریٹ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ جب کسی ملزم سے اقبالی بیان درج کرے تو اس سے دریافت کرے کہ وہ کتنے عرصے سے زیر حراست ہے۔ مجسٹریٹ کو ایسے سوالات ضرور

---

(۱) ملک ارشاد احمد ارشد، ایڈووکیٹ، قانون شہادت، آرڈر ۱۹۸۴، کمنٹری، منصور بک ہاؤس، 2 کچہری روڈ، (انار کلی، لاہور، ص:۵۹

(2) 2004,MLD,910 ,۳۹۶ Major Act 2007

(3) Major Act 2007, 2006,SCMR,231,۳۹۶

کرنے چاہییں جس پر یہ اطمینان ہو جائے کہ اقبال رضاکارانہ کیا جارہا ہے[۱] ۔ اگر کسی شخص نے عدالت میں اقبال جرم کرنا ہے تو اس کو ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۶۴ کے تحت لیا جائے گا۔ اس میں مجسٹریٹ یا عدالت اقبال جرم کرنے والے کو مکمل طور پر ترغیب دے گی اور اس اقبال جرم کے نقصانات سے آگاہ کرتے ہوئے اس بات کو باور کرے گی کہ یہ اقبال بغیر کسی خوف اور ڈر کے دیا جارہا ہے۔ مزید یہ بھی باور کرے گی کہ یہ اقبالی بیان کسی ترغیب یا ترہیب پر نہیں دیا جارہا۔ اطمینان قلب کے بعد اس کو ضبط تحریر کیا جائے گا اور عدالت اپنے تاثرات کا اظہار کرے گی۔ تب اس اقبالی بیان کو تسلیم کیا جائے گا۔

اقرار جرم کے ان اصولوں کے مطابق یہ بات بالکل کھل کر سامنے آتی ہے کہ اگر کسی ملزم نے اعتراف جرم کیا ہے تو اس کو ہر پہلو سے جانچا جائے گا کہ کہیں اس کا یہ بیان کسی لالچ، دھمکی، ترغیب، دھوکہ یا وعدہ کا نتیجہ تو نہیں ہے۔ اس پر بہت ساری عدالتوں کے ریمارکس موجود ہیں کہ ایسا اقبالی بیان جو کسی ملزم کا عدالت کی کسٹڈی میں دیا گیا ہو اس کو بھی قابل ادخال شہادت تسلیم نہ کیا جائے اور اس بیان کی تنقیح طلب واقعہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

پاکستان کے قانون میں پولیس کو جرم کی تفتیش میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اس کی تفتیش پر مقدمہ عدالت میں چلتاہ۔ لیکن تفتیش کے عمل میں اگر ملزم اقرار جرم کرتا ہے تو قانون اس کے اس اعتراف کو اس لیے قبول نہیں کرتا کہ وہ اقرار ملزم سے پولیس کی حراست میں لیا گیا ہے جس میں ملزم کا ذہنی طور پر مرعوب ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اس لیے قانون شہادت میں ایسا اقرار خواہ اسے ملزم کی مرضی پر کے ساتھ پیش کیا جائے قبول نہ ہو گا[۲] بلکہ قانون ملزم کو یہ ہمت اور حوصلہ دیتا ہے کہ اگر کسی ملزم کا پولیس کی تحویل میں اقرار جرم ہو اور اس کو قلم بند کیا جائے تو ملزم کو چاہیے کہ وہ اس پر دستخط نہ کرے اور نا ہی ایسی تحریر بطور شہادت قابل قبول ہو گی[۳] ۔

قانون شہادت میں ایسے شخص کے اقرار جرم کو ناقابل ادخال شہادت قرار دیا گیا ہے جو کسی بھی عہدہ دار کے سامنے کیا ہو مگر وہ اس وقت پولیس کی حراست میں ہو تو ایسا اقبال جرم اس شخص کے خلاف ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اگر یہ اقبال کسی عدالت یا مجسٹریٹ کے سامنے ہو تو اس کو قبول کیا جائے گا[۴] ۔

---

[۱] قانون شہادت، آرڈر ۱۹۸۴، کمنٹری، ص:۵۹

[۲] قانون شہادت آرٹیکل ۳۸

[۳] مجموعہ ضابطہ فوجداری، دفعہ، ۱۶۲

[۴] قانون شہادت آرٹیکل، ۳۹

ملزم کو بظاہر تو عدالتی تحویل میں رکھا جائے مگر اس پر پہرہ داری کے لئے پولیس ہو تو اس حراست کو پولیس کی حوالات ہی شمار کیا جائے گا اس کو عدالتی تحویل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ایک مقدمہ میں عدالتی تحویل کی صورتحال یہ بیان کی گئی تھی کہ اس پر پولیس گارڈ ایک ہیڈ کانسٹیبل کی سربراہی میں پہرہ داری تھی اور ہیڈ کانسٹیبل اپنے فرائض پولیس تھانوں کی طرح سرانجام دیتا تھا اور روزنامچہ تیار کرتا تھا، تو اس طرح تحویل میں رکھے گئے شخص کے اقبال جرم کو ناقابل ادخال شہادت قرار دیا گیا[1]۔

پاکستان میں رائج قانون کی کسی شق میں یا کسی بھی جگہ پر یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی ملزم سے تفتیش یا تحقیق و تجویز کے دوران جسمانی تشدد کی اجازت دی گئی ہو۔ بلکہ جسمانی تشدد سے قانون میں منع کیا گیا ہے۔

دیگر حصول شہادت کے لیے جسمانی تشدد:

تفتیش میں ملزم سے دیگر شہادت و بینہ کی دریافت اور حصول کے لیے بھی ملزم پر جسمانی تشدد کو روا رکھا جاتا ہے۔ کیا اقرار جرم کے علاوہ دوسری بینہ و شہادت کے لیے ملزم پر تشدد کرنا آئینی و قانونی طور پر جائز ہے؟

آئین پاکستان میں کسی بھی ملزم پر تشدد کرنے سے منع کیا گیا ہے بالخصوص جو کسی شہادت کے حصول کے لیے ہو۔ چنانچہ آئین میں درج ہے کہ:

> "No person shall be subjected to torture for the purpose of extracting evidence"[2]

"کسی شخص کو شہادت حاصل کرنے کے غرض سے اذیت نہیں دی جائے گی"

پاکستان کا کوئی بھی قانون آئین کے برعکس نہیں بنایا جاسکتا۔ مذکورہ بالا آرٹیکل کے موجود ہونے کے بعد کوئی بھی قانون ایسا تشکیل نہیں دیا جاسکتا جس میں کسی شخص کو محض اس غرض سے تشدد کا نشانہ بنایا جائے کہ اس سے شہادت کا حصول ممکن ہوسکے۔

اب اگر بات کی جائے پولیس کے جسمانی تشدد کی تو یہ بات کسی بھی مقتدر سے ڈھکی چھپی نہیں کہ پولیس ملزم پر تشدد نہیں کرتی بلکہ تفتیش کے آڑ میں ملزم پر پولیس کا بدترین تشدد سامنے آتا ہے۔ پاکستان پولیس کے ایک انوسٹی

(1) PLD,(Pakistan Law Digest)1973,Law,714

(2) The constitution of the Islamic Republic of Pakistan,Artile:14

گیشن آفیسر خود اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ تفتیش کے دوران سب سے معیوب اور غیر قانونی طریقہ تشدد کا ہے اور تشدد کے ذریعے جرم کا سراغ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے[۱]۔

پولیس کے تشدد کے چرچے تو سر عام ہیں اور تھانوں میں جو انسانیت سوز ظلم دیکھنے کو ملتا ہے جیسے چھترول کرنا، الٹا لٹکانا، تلوؤں پر ضربیں لگانا، سانس بند کرنا، پانی میں ڈبونا اس طرح کی بے شمار جسمانی اذیتیں روا رکھی جاتی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ تمام کاروائی شرف انسانیت کے برعکس ہے۔ حالانکہ آئین انسان کے اشرف ہونے کو مقدم کرتا ہے اور کسی بھی لحاظ سے شرف انسانیت کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دیتا[۲]۔ ملزم پر جسمانی تشدد تو درکنار ملزم کی تضحیک کی بھی قانون اجازت نہیں دیتا۔ اگر دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو ملزم کو سوائے بعض ناگزیر قانونی وجوہات کے ہتھ کڑی لگانا بھی درست نہیں ہے چہ جائے کہ ملزم پر بے رحمانہ تشدد کیا جائے اور اس پر جسمانی یا ذہنی تشدد کی قانونی اجازت ہو۔ ایک مقدمہ میں اسلام آباد ہائی کورٹ نے ملزم کو گرفتار کرکے اس کی تضحیک کرنے سے منع کیا ہے[۳]۔

معاشرے میں ایک غلط فہمی سرایت کر چکی ہے کہ جب عدالت کسی ملزم کا جسمانی ریمانڈ جاری کرتی ہے تو گویا کہ اس نے پولیس کو دوران تفتیش جسمانی اذیت دینے کی اجازت دے دی ہے۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تفتیشی افسر بھی ملزم پر جسمانی تشدد کو جائز سمجھنے لگے ہیں حالانکہ جسمانی ریمانڈ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پولیس ملزم کو اپنی حراست میں رکھ سکتی ہے اور ملزم سے جو معلومات درکار ہوتی ہیں وہ حاصل کرے اور عدالت ملزم سے یہ توقع کر رہی ہوتی کے ملزم پولیس کے ساتھ تعاون کرے گا۔ تاہم جسمانی ریمانڈ سے کسی بھی لحاظ سے یہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ ملزم پر دوران تفتیش جسمانی تشدد کیا جائے۔ اگر پولیس کی حراست میں ملزم پر جسمانی تشدد کیا جائے تو پولیس ایکٹ کی رو سے تشدد کرنے والے افسر کو تین سال کی قید اور جرمانہ کی سزا دی جائے گی[۴]۔ تعزیرات پاکستان کے تحت اگر پولیس تشدد کرتی ہے، زخم لگاتی ہے یا ملزم کو حبس بے جا میں رکھتی ہے تو اس کو قابل دست اندازی پولیس جرم قرار دیا گیا ہے۔ جرم ثابت ہونے پر ذمہ دار پولیسے افسر یا اہلکار کو پانچ سال قید اور جرمانہ کی سزا دی جاسکتی ہے۔

قانونی نقطہ نظر سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے کہ قانون پاکستان میں کسی تفتیش افسر کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ وہ ملزم پر کسی قسم کا جسمانی یا ذہنی تشدد کرے بلکہ اس سے بڑھ کر کوئی تفتیشی افسر کسی ملزم کی تضحیک کرنے کا بھی روادار نہیں ہے پاکستان کے آئین و قانون میں کسی شخص کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم نہیں کیا

---

(۱) شفقات احمد، چودھری، پولیس، جرائم اور تفتیش، کوآپریٹو بک کمپنی، اردو بازار، لاہور، باب9ص:120

(2) The constitution of the Islamic Republic of Pakistan,Artile:14

(۳) روزنامہ نوائے وقت، ۱۴-فروری ۲۰۲۰

(4) Police Act, Sce. 156

جاسکتا بجز اس کے کہ قانون اس کی اجازت دے۔ کسی بھی تفتیشی افسر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ملزم پر کسی سزا کی تنفیذ کرے۔ یہ کام عدالت کا ہے اور عدالت بھی وہ ہی سزا دینے کی مجاز ہے جو قانون میں جرم کے بالمقابل درج ہے۔

ملزم پر جسمانی تشدد کا شرعی تصور

قانونی بحث کے بعد اسلامی تناظر میں ملزم پر جسمانی تشدد کے جوزاو عدم جوزا پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ اسلام ایک ابدی اور لافانی مذہب ہے جس کا ہر قانون فطرت انسانی کا عکاس ہے۔ عدل و انصاف اسلام کا خاصہ ہے۔ اسلام کا عدالتی نظام انتہائی فعال اور منظم ہے جس میں بلا تخصیص تنفیذ سزا کا حکم ہے۔ یہ سزا خواہ کسی وقت کے حاکم کے خلاف ہو یا رعایا کے کسی فرد کے خلاف، اسلام کی عدالت میں مجرم ضرور سزا پاتا ہے۔ اسلام نے انسان کے جان و مال اور عزت کو محفوظ کر دیا ہے اگر کوئی شخص کسی بے گناہ پر جھوٹا الزام لگاتا ہے اور اس کی عزت نفس کو داغدار کرتا ہے تو شریعت اسلامیہ میں اسے جرم قرار دیا گیا ہے جس کی سزا قوانین اسلام میں قصاص کے زمرے میں درج ہے۔ جب جھوٹے الزام لگانے کو شریعت میں جرم قرار دیا گیا ہے تو محض الزام کی بنا پر کسی کو زدو کوب کرنا اور دوران تفتیش اس پر جسمانی تشدد کرنے کی اسلام کیوں کر اجازت دے گا۔ اسلام میں حاکم کو یا مقتدر کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی دانست کے مطابق جو مرضی آئے کرتا چلا جائے اگر وہ بھی عدل و انصاف سے ہٹ کر کوئی قدم اٹھائے گا جس سے کسی شخص کے حقوق پامال ہوتے ہوں تو اسلام اس مقتدر پر بھی تنفیذ سزا کا حکم صادر کرتا ہے۔ ذیل میں چند ایک امثلہ اس ضمن میں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت عمر ؓ نے اپنے گورنروں کو ایک خطبہ میں کہا کہ گورنروں کو اس لئے مقرر نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے جسموں کو اذیت دیں یا ان کا مال ہڑپ کر جائیں اگر کسی گورنر نے ایسا کیا تو میں اس سے قصاص لوں گا، اس پر حضرت عمرو ابن العاص نے کہا کہ اگر کوئی حاکم اپنی رعایا کی اصلاح کے لئے ایسا کرتا ہے کہ کسی شخص کو سزا دیتا ہے تو کیا اس سے بھی قصاص لیا جائے گا؟ تو جواب میں سیدنا عمر نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں اس سے بھی قصاص لوں گا کیونکہ آپ ﷺ نے اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کیا[۱]۔ اسی طرح ایک مقدمہ میں حضرت عمر نے حضر عمرو بن العاص کو کھلی عدالت میں قصاص کے لئے طلب کیا اور مجروح سے کہا کہ اپنے سو کوڑوں کا بدلہ لے لو جس پر حضر عمرو بن العاص نے ہر کوڑے پر دو اشرفیاں دے کر مضروب کو راضی کیا[۲]۔

---

(۱) أبو داود، سليمان بن الأشعث، (دون السنة)، السنن، الناشر: المكتبة العصرية، صيدا، بيروت. ٤/١٨٣، رقم الحديث، ٤٥٣٧

(۲) أبو يوسف يعقوب بن إبراهيم بن حبيب بن سعد بن حبتة الأنصاري، (دون السنة)، الخراج، الناشر: المكتبة الأزهرية للتراث.ص ١٢٩

حضرت نعمان بن بشیر کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں ایک شخص کو چوری کے جرم میں لایا گیا۔ آپؓ نے اسے قید کیا، اس سے تفتیش کی اور کوئی قرینہ بھی سامنے نہ آیا کہ ملزم نے چوری کی ہے تو آپؓ نے اسے چھوڑ دیا۔ مدعی نے آکر دریافت کیا تو آپؓ نے کہا کہ اس پر الزام ثابت نہیں ہوا اس لئے اسے چھوڑ دیا گیا ہے، اس پر مدعی نے کہا کہ آپ نے بغیر سختی کئے اور مارے اسے چھوڑ دیا ہے اس سے شائد وہ اعتراف کرلیتا۔ حضرت نعمان نے فرمایا کہ میں اس کی پیٹھ پر کوڑے مارتا ہوں اگر مال برآمد نہ ہوا تو اتنے کوڑے آپ (مدعی) کی پیٹھ پر ماروں گا، اس پر مدعی نے کہا کہ یہ آپ کا حکم ہے؟ تو آپؓ نے جواب دیا کہ نہیں یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے[۱]۔ اگر ملزم کو غلطی کی بنا پر سزا دی گئی ہے تو اس میں تاوان ہے اسی لئے حدیث میں معاف کرنے کی غلطی کو سزا دینے کی غلطی پر ترجیح دی گئی ہے[۲]۔ حضرت عمر کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کسی شخص کو غلطی کی بنا پر سزا دی تو بعد میں معلوم ہونے پر خود کو قصاص کے لئے پیش کیا اور معافی مانگی[۳]۔

شریعت اسلامیہ میں قصاص کا قانون انتہائی اہم ہے۔ زبان درازی سے لے کر دست درازی تک ہر قسم کے جانی ومالی نقصان کا ازالہ قصاص کی صورت میں موجود ہے۔ معاشرے کا عام فرد تو درکنار کسی مقتدر کو بھی یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے ایسا فعل سر انجام دے جس سے کسی شخص کی عزت نفس پامال ہو۔ شہادت کے حصول اور اقرار جرم کے لیے ملزم پر تادیبی سزا کے نفاذ کی شرعی حیثیت کیا ہوسکتی ہے؟ ذیل میں اس پر بحث رقم کی جاتی ہے۔

اقرار جرم بالجبر کی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض امور میں اسے قبول کیا جاتا ہے اور بعض مقدمات میں اس کے قبول کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں جیسے حقوق اللہ یا حدود اللہ میں کسی شخص کو نا تو قید کیا جاسکتا ہے اور نا ہی جبراً اس سے اقرار لینے کی اجازت ہے گر کسی ملزم کو مارتے ہوئے اقرار لیا جائے گا تو یہ اقرار معتبر نہ ہوگا[۴]۔ اس لیے ایسے امور جن میں کیپیٹل پنشمنٹ کا عمل دخل ہے وہاں اقرار بالجبر کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی شخص کو مار پیٹ کر چوری کا اقرار

---

(۱) أبو داود، سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدي، السنن، الناشر: المكتبة العصرية، صيدا، بيروت. ١٣٥/٤،رقم الحديث:٤٣٨٢

(۲) الترمذي، محمد بن عيسى بن، (١٣٩٥هـ)، السنن، الناشر: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر. ٨٥/٣، رقم الحديث،١٤٢٤

(۳) أبو يوسف يعقوب بن إبراهيم بن حبيب بن سعد بن حبتة الأنصاري، (دون السنة)، الخراج، الناشر: المكتبة الأزهرية للتراث. ص ١٢٨

(۴) الماوردي، أبو الحسن علي بن محمد بن محمد بن حبيب، (دون السنة)، الأحكام السلطانية للماوردي، الناشر: دار الحديث، القاهرة . ص٣٢٢

کروایا جائے تو اس اقرار پر قطع ید کی سزا نہیں دی جاسکتی اور ناہی اس سے مؤاخذہ مال کیا جاسکتا ہے[1]۔ حضرت عمر نے اقرار بالجبر کے بارے میں فرمایا کہ اگر کسی ملزم کو قید کیا جائے، بھوکا رکھا جائے یا ڈرایا جائے اس سے بعید نہیں کہ وہ اپنے خلاف کسی جرم کا اقرار کرلے۔[2] یہ اقرار کی وہ صورت ہے جس میں جرم کا تعلق خود مقر کی ذات سے ہوتا ہے اور اس کی سزا بھی اسی کو ملتی ہے۔ ایسا اقرار جو جبر کی بنا پر کیا گیا ہو اگر ملزم جبر کی کیفیت کے ختم ہونے پر اس کا انکار کردیتا ہے اور اس وقت تک اس سے مطلوبہ مقصد بھی اخذ نہیں ہوتا تو مقر کو اس کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ اگر کوئی اقرار جبر کی بنا پر کروایا گیا ہو تو جیسے ہی جبر ختم ہوگا یا اٹھے تو مقر اس کا انکار کرسکتا ہے[3]۔

اگر اقرار کسی اطلاع سے متعلق ہو اور ملزم اس بات کو چھپانا چاہ رہا ہو تو اس صورت میں اقرار کے لئے جبر کا جواز موجود ہے جیسے اگر کسی شخص نے کسی مجرم کو پناہ دی ہوئی ہے اور ثابت ہوگیا کہ اس نے پناہ دی ہے تو اس کو مجرم کی بازیابی کے لئے پیٹا جائے گا اگر وہ بتادے تو درست ورنہ اس کو تب تک قید کیا جائے گا جب تک کہ وہ بتانہ دے۔ اس صورت میں اقرار کی کیفیت کچھ اور ہے یہ اقرار جرم اصل مجرم تک پہنچنے کے لئے کروایا جارہا ہے۔ ہاں اگر مجرم کے بارے میں جانتا نہیں مگر قرابتداری ہے اور مجرم کے ٹھکانے کا اور اس کے مال کے چھپانے کا علم نہیں تو تحقیق کی جائے بغیر تحقیق کے اس کو عقوبت سے گزارنا قطعاً جائز نہیں[4]۔ مزید یہ کہ اگر ملزم سے متعلق ایسے ثبوت موجود ہیں کہ وہ عادی مجرم ہے یا اس پر لگنے والے الزام کے ثبوت میں قرینے موجود ہیں تو اس صورت میں قاضی ملزم سے اقرار بالجبر کرواسکتا ہے جیسے قرض وغیرہ سے متعلق تحریر موجود ہے مگر شہادت یا گواہ میسر نہیں ہیں تو اس صورت میں قاضی ملزم کو قید بھی کرسکتا ہے اور اسے ڈرادھمکا کر اعتراف بھی کرواسکتا ہے[5]۔ ایسے اقرار بالجبر کا مقصد حقائق کا معلوم کرنا ہے اور اس کے پیچھے تفتیش کے عمل میں قرینہ کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر قرینہ موجود نہیں ہے تو ملزم کو قید کرنا، سزا دینا، یا زدوکوب کرنا شرعاً جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ قرینہ کی موجودگی میں اقرار بالجبر کی چند ایک امثلہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

---

(۱) أبو يوسف يعقوب بن إبراهيم بن حبيب بن سعد بن حبتة الأنصاري، (دون السنة)، الخراج، الناشر: المكتبة الأزهرية للتراث. ص١٩١

(۲) نفس المصدر

(۳) النسفي، أبو البركات عبد الله بن أحمد بن محمود، (٢٠١١م)، كنز الدقائق، الناشر: دار البشائر الإسلامية، دار السراج. ص ٥٦٩

(۴) ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم، (١٤١٨هـ)، السياسة الشرعية في إصلاح الراعي والرعية، الناشر: وزارة الشئون الإسلامية والأوقاف والدعوة والإرشاد، المملكة العربية السعودية. ص: ٧٥

(۵) ماوردي، الأحكام السلطانية، ص١٤١

ایک جاسوس خاتون جس کے بارے میں آپ ﷺ نے حضرت علی کو روانہ کیا کہ اس سے خط لے کر آئیں آپؓ اس خاتون سے خط نکالنے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میرے پاس نہیں ہے اس پر حضرت علی نے اس سے خط نکلوانے کے لئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا کہ آپ خط دے دیں ورنہ ہم آپ کو برہنہ کریں گے[1]۔ اس خوف سے اس نے خط نکال دیا۔ اس واقعہ میں خط کے حوالے سے مصدقہ خبر موجود تھی اور یہ خبر ایک قوی شہادت تھی کیونکہ آپ ﷺ نے اس سے خط لینے کو کہا تھا۔ لہٰذا حضرت علی کا اس خاتون سے اقرار خط کروانا اور خط نکلوانا جو دھمکی پر مبنی تھا دراصل اقرار بالجبر کی ہی ایک صورت ہے جو کہ بالکل درست ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک مقدمہ لایا گیا جس میں ملزم ابن ابی الحقیق کو پیش کیا گیا۔ اس شخص پر خیبر کے غزوہ کے بعد خزانہ چھپانے کے الزام تھا۔ یہ ملزم یہاں تک تو اقرار کرتا تھا کہ خزانہ اس نے حاصل کیا ہے مگر وہ کہتا تھا کہ اب وہ خرچ ہو چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شبہ کی بنا پر کہ خزانہ اس کے پاس موجود ہے کیونکہ قیاس یہ کیا گیا کہ مال زیادہ ہے اور خیبر کے واقعہ کو وقت کم گزرا ہے، اسی بنا پر اس کو قید میں رکھنے کا نہ صرف حکم دیا بلکہ حضرت زبیر بن عوام کو تحقیق کرنے پر مامور فرمایا۔ حضرت زبیر بن عوام نے تحقیق کے دوران اس پر تادیبی سزا کا نفاذ بھی کیا جس سے اس شخص نے چھپائے ہوئے خزانے کے بارے میں تمام بتادیا[۲]۔

شریعت کی رو سے قاضی یا حاکم کو تفتیش میں تادیبی سزا کا اختیار سامنے آتا ہے۔ حالات و واقعات کے مدنظر رکھتے ہوئے قاضی ملزم پر تادیبی سزا چند شرائط کے ساتھ نافذ کر سکتا ہے تاکہ وہ ملزم سے معلومات اخذ کر سکے۔ بعض ملزم جرائم پیشہ ہوتے ہیں اور ان کا معاشرے میں تعارف ایک مجرم کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ یا ایسے لوگ ہوتے ہیں جو مجرم کا ساتھ دینے والے ہوتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں اگر قاضی یہ محسوس کرے کہ ملزم کچھ چھپا رہا ہے تو اس پر شرعاً جسمانی تشدد کرنا جائز قرار دیا گیا ہے لیکن اس تشدد کی نوعیت تادیبی ہو گی جرم کی سزا کے مترادف نہ ہو گی۔

تفتیش میں ملزم پر تشدد کے حوالے سے الماوردی فرماتے ہیں کہ جب ارتکاب جرم کا قرینہ موجود ہو اور ملزم اعتراف نہ کر رہا ہو یا کسی مقدمہ میں گواہوں کی حاضری نہ ہو سکے تو اس صورت میں قاضی پولیس کے ذریعے ملزم کو حراست میں لے سکتا ہے، اقرار کے لیے دباؤ ڈال سکتا ہے تاکہ ملزم سے متعلقہ حقیقت معلوم کی جاسکے۔

---

(۱) بخاري، محمد بن إسماعيل، (١٤٢٢هـ)، الصحيح، دار طوق النجاة. ٥٩/٤، رقم الحديث: ٣٠٠٧

(۲) ابن فرحون، إبراهيم بن علي بن محمد، ابن فرحون، برهان الدين اليعمري، (١٤٠٦هـ)، تبصرة الحكام في أصول الأقضية ومناهج الأحكام، الناشر: مكتبة الكليات الأزهرية . ٢ /٨٦

اسی طرح اگر کسی مقدمہ میں مدعاعلیہ پر جو الزام لگا ہے اس سے متعلقہ ضمنی شہادت یا دستاویزی شہادت موجود ہے اگر ملزم دستاویزی شہادت کو تسلیم کرلے تو فیصلہ اس پر ہوگا اوراگر ملزم اس سے انکاری ہے تو قاضی دستاویزی شہادت کی چھان بین کرے گا اور تحقیق کے بعد اگر دستاویز درست معلوم ہوتی ہیں تو مدعی کو ڈرادھمکا کر درست بات معلوم کرے گا[(۱)]۔

قاضی شریح تفتیش میں سختی کرنے کو جائز سمجھتے تھے مگر اس وقت جب ملزم پر قرائن سے الزام درست معلوم ہوتا ہو اور ملزم اس سے کلیۃ انکاری ہو جبکہ حالت وواقعات میں ملزم پر جرم کے ثبوت کے قرینے موجود ہوں تو قاضی ملزم پر سختی کے ساتھ حقیقت حال سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں پر الزام لگایا گیا تو قاضی شریح نے اسے دھمکانا شروع کیا، لوگوں نے کہا کہ یہ درست نہیں کہ آپ شک کی بنا پر گرفت کرتے ہیں۔ تو اس پر انہوں نے کہا کہ مذبوح بکرے کی کلیجی گم ہوجائے تو قصاب کے علاوہ کس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا[(۲)]۔

حضرت علی نے ایک مقدمہ میں ملزموں کو بذریعہ پولیس گرفتار کروایا اور ان کو قید کیا پھر ہر ایک پر دو نگران مقرر کئے تاکہ وہ آپس میں کوئی تدبیر نہ کرسکیں۔ اس کے بعد ان میں سے ہر ایک کے ساتھ سخت لہجے میں اور سخت الفاظ میں تفتیش کی۔ ہر ایک سے دوسرے کو علیحدہ بٹھایا اور غضبناک انداز اختیار کیا یہاں تک کہ انہوں نے اپنے جرم کے اقرار کرلیا[(۳)]۔

ایک یہودی نے ایک خاتون کو قتل کیا، آپ ﷺ نے اس خاتون سے دریافت کیا جس نے تیسری مرتبہ اثبات میں سر ہلایا، یہودی کو پکڑ کر لایا گیا تو اس پر خاصی سخت تفتیش کی گئی جس کے بعد اس نے اعتراف کرلیا[(۴)]۔
ہوا کہ تفتیش میں اصل بات کا ثبوت تلاش کرنے کے لئے ایسا حربہ استعمال کیا جاسکتا ہے جو ملزم کو زہنی طور پر مرعوب کردے اور وہ سچ اگلنے لگے یا کسی حد تک تادیبی سزا دینا موزوں قرار دیا گیا ہے۔

---

(۱) ماوري، الأحكام السلطانية، ص١٤٣

(۲) وكيع، أبي بكر محمد بن خلف بن حيان بن صدقة الضبي البغدادي، (١٩٤٧م)، أخبار القضاة، الناشر: المكتبة التجارية الكبرى، بشارع محمد علي بمصر لصاحبها: مصطفى محمد. ٢/ ٢٧٤

(۳) الطرابلسي، أبو الحسن، علاء الدين، علي بن خليل، (دون السنة) معين الحكام فيما يتردد بين الخصمين من الأحكام، الناشر: دار الفكر، بيروت، لبنان. ص ١٧٣

(۴) بخاري، الصحيح، ٥/٩، رقم الحديث، ٦٨٧٩

ملزم پر تادیبی سزا کی حد:

کسی ملزم پر بھی جسمانی سزا مناسب نہیں خیال کی جاتی سوائے اس کے کہ جس کی ضرورت ہو مگر وہ اس قدر نہ ہو کہ ملزم کو مجرم کی سزا دی جائے۔ تادیبی سزا کا بھی حد سے تجاوز ظلم کے مترادف ہے۔ ایک ملزم کو ڈرانا دھمکانا اور اس کو تادیبی سزا دینے کا جواز تو معلوم ہوتا ہے مگر اس قدر سزا دینا کہ وہ حد سے تجاوز کر جائے ایسی سزا قابل قصاص ہے۔ حضرت عمر نے اپنے مکتوب میں بڑے واضح طور پر لکھا کہ اگر کسی شخص نے کسی کو تعزیری سزا دی (جو بلا وجہ ہو یا حد سے زیادہ ہے) تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔[(۱)] رسول اللہ ﷺ نے نمازیوں کو مارنے سے منع کیا ہے[(۲)]۔ نماز کے پابند لوگوں کو سزا دینا سوائے اس کے کہ ان پر جرم ثابت ہو جائے یا حدود کا معاملہ ہو منع کیا گیا ہے[(۳)]۔ اگر تادیبی یا تعزیری سزا کے دوران کسی شخص کو نقصان ہو جائے تو اس کا ضمان واجب ہوتا ہے[(۴)]۔

اگر کسی ملزم پر قوی تہمت ہو اور قرائن بھی اس کے ثبوت میں موجود ہوں تو اس وقت ملزم کو اس قدر سزا دینا جو حد سے تجاوز نہ کرے، جائز ہے۔ ایک مقام پر امام ابو یوسف نے خلیفہ وقت کو اس کے آدمیوں کے ظلم کے بارے میں لکھا کہ وہ ملزموں کو اس قدر شدید سزا دیتے ہیں کہ دو سو تین سو کوڑے مارتے ہیں۔ اس طرح کی سزا کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمان کی ذات محفوظ و محترم ہے سوا اس کے کہ اس سے فحاشی، قذف یہ ایسا جرم ہو جس کی سزا حد بیان کی گئی ہو[(۵)]۔

ملزم کے اہل و عیال کو بغیر کسی قوی قرینہ کے قید میں رکھنا شرعاً جائز نہیں۔ باغی لوگوں کے ساتھ جنگ جائز ہے مگر ان کے گھر والوں کو گرفتار کرنا اور قید میں رکھنا جائز نہیں[(۶)]۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کسی رشتہ دار نے یا

---

(۱) أبو يوسف، كتاب الخراج، ص ١٢٩

(۲) الدار قطني، أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي، (١٤٠٢هـ)، سنن الدار قطني، الناشر: مؤسسة الرسالة، بيروت، لبنان. ٢ /٣٩٩، رقم الحديث، ١٧٥٧

(۳) أبو يوسف، الخراج، ص١٦٥

(۴) ماوردي، الأحكام السلطانية، ص ٣٤٧

(۵) أبو يوسف، كتاب الخراج، ص١٦٥

(۶) كنز الدقائق، ٣٩٠

کسی اس کے تعلق والے نے ملزم کو پناہ دی ہے یا اس کو اس کے روپوش ہونے یا چھپنے کا علم ہے تو اس کو پکڑنا اور اس سے معلومات لینا جائز قرار دیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ملزم پر جسمانی تشدد کا جواز پاکستان کے رائج قانون میں نظر نہیں آتا بلکہ ملزم کو محض الزام کی بنا پر بغرض حصول شہادت آئین پاکستان میں کلیۃ منع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی افسر ملزم پر دوران تفتیش تشدد کرتا ہے تو یقیناً وہ آئین پاکستان کے مذکورہ آرٹیکل کی خلاف ورزی کرتا ہے اور جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔

جہاں تک شریعت میں ملزم پر جواز کی بات سامنے آتی ہے حالات و واقعات کے پیش نظر قاضی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ملزم کے ارتکاب جرم پر قرینہ موجود ہے اور اور اگر تفتیش کرتے ہوئے اس پر تادیبی سزا نافذ کی جائے تاکہ جرم کا سزاغ مل جائے تو اس کی جواز کی صورت سامنے آتی ہے۔ دوسری طرف بغیر کسی قوی قرینہ کے اگر ملزم کو زدو کوب کیا جاتا ہے یا اس کو ذہنی آزمائش میں اس طرح مبتلا کیا جاتا ہے جس سے اس کو نقصان ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسا طرز عمل اختیار کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی بلکہ اس طرح کے طرز عمل اختیار کرنے والے پر قصاص کی سزا نافذ کی جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

١. بخاري، محمد بن إسماعيل، (١٤٢٢هـ)، الصحيح، دار طوق النجاة.
٢. الترمذي، أبو عيسى محمد بن عيسى، (١٣٩٥هـ)، السنن، الناشر: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر
٣. ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم، (١٤١٨هـ)، السياسة الشرعية في إصلاح الراعي والرعية، الناشر: وزارة الشئون الإسلامية والأوقاف والدعوة والإرشاد، المملكة العربية السعودية
٤. أبو داود سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدي، السنن، الناشر: المكتبة العصرية، صيدا، بيروت
٥. الدار قطني، أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي، (١٤٠٢هـ)، سنن الدار قطني، الناشر: مؤسسة الرسالة، بيروت، لبنان
٦. روزنامہ نوائے وقت
٧. شفقات احمد، چودھری، پولیس، جرائم اور تفتیش، کوآپریٹو بک کمپنی، اردو بازار، لاہور
٨. الطرابلسي، أبو الحسن، علاء الدين، علي بن خليل، (دون السنة) معين الحكام فيما يتردد بين الخصمين من الأحكام، الناشر: دار الفكر، بيروت، لبنان.

٩. ابن فرحون، إبراهيم بن علي بن محمد، ابن فرحون، برهان الدين اليعمري، (١٤٠٦هـ)، تبصرة الحكام في أصول الأقضية ومناهج الأحكام، الناشر: مكتبة الكليات الأزهرية

١٠. الماوردي، أبو الحسن علي بن محمد بن محمد بن حبيب، (دون السنة)، الأحكام السلطانية للماوردي، الناشر: دار الحديث، القاهرة

١١. النسفي، أبو البركات عبد الله بن أحمد بن محمود، (٢٠١١م)، كنز الدقائق، الناشر: دار البشائر الإسلامية، دار السراج

١٢. ملک ارشاد احمد ارشد، (س۔ن)، قانون شہادت، آرڈر ۱۹۸۴، کمنٹری، منصور بک ہاؤس، 2 کچہری روڈ، انار کلی، لاہور

١٣. وكيع، أبي بكر محمد بن خلف بن حيان بن صدقة الضبي البغدادي، (١٩٤٧م)، أخبار القضاة، الناشر: المكتبة التجارية الكبرى، بشارع محمد علي بمصر لصاحبها: مصطفى محمد

١٤. أبو يوسف يعقوب بن إبراهيم بن حبيب بن سعد بن حبتة الأنصاري، (دون السنة)، الخراج، الناشر: المكتبة الأزهرية للتراث

15. Major Act 2007 ,A Publication of PLJ Committee,Punjab Bar Council, 9-fane Road, Lahore
16. Cambridge Advanced Learner`s Dictionary Third Edition
17. Code of Criminal Procedure 1898
18. Constitution of Pakistan
19. Featuring Black's Law Dictionary Free Online Legal Dictionary 2nd Ed
20. PLD 1973 (Pakistan Lwa Digest)
21. Police Act 1861
22. Qanun-e-Shahadat Order,1984

بین المذاہب رواداری اور عصر حاضر میں اس کی ضرورت واہمیت

Interfaith harmony and its need and importance in the contemporary era

☆ محمد اظہر عباسی

☆☆ محمد پرویز

ABSTRACT

The significance of Islamic teachings is being realized and cleared as a man gets familiar with the social practices of the pre-Islamic era. That was the era when the social evils such as ignorance, intolerance, blood bathing, cruelty, injustice and many more were prevailed and became accustomed. Amidst those dark ages, the prophet of Islam i.e. Muhammad (ﷺ) graced this universe. He (ﷺ) was the embodiment of love, who spread the message of love, tranquility, mercy, peace, and tolerance. He (ﷺ) demonstrated with his teachings how ignorant society can be turned into the most civilized nation of that time through tolerance, equality, and justice. He exemplified with his behavior how the people who belong to different religions, creed, and race can live together in a peaceful way. In the modern time of globalization, tolerance among the people of different religions and nations becomes more important and indispensable. In present times, this is also a key to establish a Utopian and peaceful society hence a peaceful world. In this research, the concept of tolerance among different religions is explained and this study also sheds light on the need for tolerance, love and harmony from different directions and perspectives.

Keywords: Islam, interfaith harmony, society, needs and importance

انسانی زندگی میں اسلامی تعلیمات کی اہمیت اس وقت مزید نمایاں ہوتی ہے۔ جب دور جاہلیت کے معاشرتی حالات سے واقفیت ہوتی ہے۔ جہاں عداوت و دشمنی کا دور تھا، معمولی باتوں پر جنگ و قتال برسوں جاری رہتا، ان حالات میں محسن انسانیت اور رحمت دو عالم ﷺ نے انسان کو ایک نئے معاشرتی وصف سے روشناس کرایا۔ یہ ایسا وصف تھا جو معاشروں کے قیام اور باہمی روابط استوار کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ وصف احترام آدمیت، مذہبی آزادی، اور معاشرتی مساوات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ وصف

☆ پی۔ایچ۔ڈی اسکالر / لیکچرار منہاج یونیورسٹی، لاہور

☆☆ پی۔ایچ۔ڈی اسکالر منہاج یونیورسٹی، لاہور

تہذیبوں کو اپنا تشخص برقرار رکھنے کی تعلیم بھی دیتا ہے نیز تہذیبوں کے مابین پائی جانے والی خلیج بھی کم کرتا ہے اور باہمی تبادلہ خیال کے ذریعے مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ اس اہم سماجی، معاشرتی، اخلاقی وصف سے مراد رواداری ہے۔ پس رواداری کا عام اور سادہ سا اصول یہ ہے کہ ”انسان اپنا موقف چھوڑے نہ اور دوسرے کے موقف کو چھیڑے نہ“ اسلامی رواداری اسی موقف کا نام ہے۔

دنیا بھر میں پائے جانے والے مذاہب کے درمیان رواداری، ہم آہنگی اور مفاہمت کی اصطلاح ایک عرصے سے دنیا بھر میں چل رہی ہیں۔ بین المذاہب رواداری کو فروغ دینا ہر دور میں ضروری رہا ہے لیکن آج جب دنیا سمٹ کر (Global village) اور اس سے آگے نکل کر (Global hut) کی صورت اختیار کر چکی ہے تو اس کی ضرورت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے تاکہ مختلف مذاہب اور عقائد و نظریات کے لوگ مل جل کر ایک سوسائٹی (Society)میں امن و محبت کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ اور مذاہب کے جو اختلافات و افتراقات ہیں وہ کش مکش اور تصادم کی صورت اختیار نہ کریں۔ کیونکہ مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان شدت پسندی اور انتہاء پسندی کے رجحانات میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ماضی میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان تصادم، محاذ آرائی اور قتل و قتال کا جو سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ اس کا تسلسل آج بھی موجود ہے عنوانات تبدیل ہونے کے باوجود، مذہبی شدت پسندی اور انتہاء پسندی بدستور انسانی معاشرے میں موجود ہے اور نیوزی لینڈ جیسے ترقی یافتہ معاشرے میں بھی اس کے اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے، کرائسٹ چرچ مسجد میں درجنوں معصوم اور نہتے مسلمانوں کو جس بے دردی اور سفاکیت سے شہید کیا گیا ہے اس سے روادری و ہم آہنگی اور مکالمہ بین المذاہب کی ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے رواداری کو تعصب کے برعکس پہچانا جاتا ہے اور تعصب کی اصل اور اس کا مصدر انسانی تاریخ میں یک طرفہ سوچ اور تنگ نظری ہے۔ مقالہ ھذا میں رواداری کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے اور عصر حاضر کے تناظر میں اس کی ضرورت و اہمیت کو مختلف زاویوں اور جہتوں سے بیان کیا گیا ہے۔

رواداری کا لغوی معنیٰ

اردو لغت کی مشہور کتاب فیروز اللغات میں لفظ رواداری کی وضاحت درج ذیل الفاظ میں کی گئی ہے:

"رواداری(ف۔ا ۔مث) یعنی رواداری فارسی کا لفظ ہے، بطور اسم مونث استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں بے تعصبی اور رعایت کے ساتھ کسی فعل کا جائز رکھنا"۔(۱)

رواداری کے لئے عربی میں تسامح کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ تسامح کا مادہ اشتقاق سمح (س۔ م۔ ح) ثلاثی مجردہے۔ اور اس کا معنی جودو سخاوت اور سہولت ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے اہل لغت کہتے ہیں:رجلٌ سمحٌ یعنی سخی آدمی۔(۲)

انگریزی لغت کی کتاب آکسفورڈ لرنز ڈکشنری میں رواداری کے مندرجہ ذیل لغوی معنی بیان کیے گئے ہیں۔

"Harmony or Tolarnce: A state of agreement in feelings interests, opinions."(3)

"(رواداری) انسانی رویے کی (ایسی حالت کو کہتے ہیں جس میں مختلف احساسات مفادات اور تصورات کا معاہدہ ہوتا ہے۔"

اس تعریف کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رواداری اس انسانی رویے کا نام ہے جس میں ایک شخص دوسرے شخص کے مختلف مفادات، تصورات اور اس کے احساسات کی قدر کرتا ہے۔

رواداری کا اصطلاحی معنی

رواداری ایک ایسی اصطلاح ہے جسکا آغاز مختلف ادیان کے محققین علماء نے اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں کیا ۔اگرچہ رواداری (تسامح) کا لفظ نص قرآنی میں وارد نہیں ہوا مگر اس کے مترادفات ضرور استعمال ہوئے ہیں۔ احادیث مبارکہ میں بھی یہ لفظ ، آسانی، نرمی،سہولت، معافی، درگزر، بردباری کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ذیل میں رواداری کے اصطلاحی معنی کی وضاحت کے لئے چند حوالہ جات پیش کیے جاتے ہیں۔ مسلم محققین میں ابن عاشور جو دور جدید کے عظیم محقق گزرے ہیں، نے رواداری کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

---

(۱)مولوی فیروز الدین،(س۔ن)، فیروز اللغات اردو، فیروز سنز، اردوبازار ,لاہور۔پاکستان ص:۷۳۳

(۲)ازہری، ابومنصور محمد بن احمد،(۲۰۰۱ء)،تہذیب اللغۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان. ۴/ ۲۰۰

(3)Jonathan Crowther, (1995), Oxford Advanced learner's Dictionary, Oxford University New York, P:544

رواداری کے اصطلاحی مفہوم بیان کرتے ہوئے امام محمد طاہر بن عاشور لکھتے ہیں:

''التسامح في اللغة مصدر، سامحه إذا أبدى له السماحة القوية لأن صيغة التفاعل هنا ليس فيها جانبان فتعين أن يكون المراد بها المبالغة في الفعل مثل :عافاک الله، التسامح وهو لفظ اصطلح عليه العلماء الباحثون عن الأديان من المتأخرين من أواخر القرن الماضي أخذ من الحديث النبوية (بعثت بالحنيفية السمحة) (وقد صار هذا اللفظ حقيقة عرفية في هذا المعنى''(۴)

''(تسامح) رواداری (لغوی اعتبار سے) باب تفاعل سے (مصدر ہے) سامحہ کا معنی ہے جب کوئی کسی کے لئے بڑھ چڑھ کر جودو سخا کا مظاہرہ کرے۔ کیونکہ یہاں تفاعل کے صیغے میں طرفین) یعنی دونوں اطراف(موجود نہیں) کیونکہ تفاعل کے خواص میں سے ایک خصوصیت مشارکہ ہے جو کہ یہاں موجود نہیں، یہاں باب تفاعل فَعَلَ ثلاثی مجرد کی موافقت میں آیا ہے (اس لئے یہاں اس بات کا تعین ہو گیا کے یہاں اس سے مراد فعل میں مبالغۃ ہو گا۔ جیسے اللہ تجھے) ہر شر اور تکلیف سے (محفوظ رکھے) یہاں بھی فعل میں مشارکہ نہیں بلکہ مراد مبالغہ ہے۔''

گویا رواداری ایک ایسا لفظ ہے جس کو متاخرین مذہبی محققین نے پچھلی صدی عیسوی کے اواخر میں بطور اصطلاح اختیار کیا۔ علماء نے اس حدیث نبوی سے اس اصطلاح کو اخذ کیا:

''بعثت بالحنيفية السمحة''(۵)

''بے شک میں دین حنیف یعنی سچے اور اعتدال والے (دین کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں۔''

امام ابن عاشور مزید لکھتے ہیں کہ:

''بعد ازاں یہ لفظ رواداری کی اصطلاح میں حقیقت عرفی بن گیا، اس کا مترادف لفظ تساہل ہے۔ لیکن اگر اس لفظ تساہل کو رواداری کے معنی میں استعمال کریں، تو اس کے استعمال سے یہ خدشہ پید اہوتا ہے کہ ایک مسلمان دینی احکام میں تساہل برتنے کی روش اختیار کرے گا۔ اس لیے محققین نے تسامح

(۴)ابن عاشور، امام محمد الطاہر،(س۔ن)، اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام، طبع ثانی، المؤسسۃ الوطنیۃ لکتاب الجزائر۔ ص:۲۲۶

(۵)احمد بن حنبل،(س۔ن)،المسند،مؤسسہ قرطبہ،مصر۔۵/۲۶۶،رقم:۲۲۳۴۵

کے لفظ کو رواداری کے معنوں میں استعمال کرنے کے لیے خاص کیا۔ اب اس لفظ کو کسی اور لفظ سے بدلنا مناسب نہیں۔"(٦)

علامہ ماجد غرباوی رواداری کی اصطلاح کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"مفهوم التسامح (Toleration) ظهر في القرن ١٧-١٨م"(٧)

"رواداری کا تصور سترویں اٹھارویں صدی عیسوی میں سامنے آیا۔"

چنانچہ عصر حاضر میں جب لفظ رواداری بولا جائے گا تو اس سے مراد مذاہب کے درمیان ہم آہنگی بردباری اور رواداری لی جائے گی۔

فن اصطلاحات کی جدید کتاب "المعجم الفلسفی" میں رواداری کی بحث ان الفاظ میں آئی ہے۔

"فإن التسامح يأتي بمعنى أن تترك لكل إنسان حرية التعبيرعن آرائه وإن كانت متضادة لآرائك وأن يحترم الآراء غيره لإعتقاده إنها محاولة للتعبير عن جانب من جوانب الحقيقة. والتسامح كما يقول گوبلو: لا يوجب على المرء عن معتقداته أو الإمتناع عن إظهاره أو الدفاع عنها أو التعصب لها بل يوجب عليه الإمتناع عن نشر آرائه بالقوة والقسر والقدح والخدأ"(٨)

"رواداری سے مراد یہ ہے کہ انسان کو حقیقت کی تعبیر کا عقیدہ رکھتے ہوئے اور دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی مکمل اجازت دی جائے۔ مشہور فلاسفر (Goblo) کہتا ہے: انسان پر لازمی نہیں کہ وہ اپنے عقیدے سے ہٹ جائے یا اس کے دفاع سے رک جائے یا اس پر مضبوطی سے کاربند نہ ہو بلکہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ طاقت ، جبر، جھوٹ، اور دھوکہ دہی سے اس کو پھیلانے سے باز رہے"۔

---

(٦)ابن عاشور، امام محمد الطاہر،(س۔ن)، اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام، طبع ثانی، الموسسۃ الوطنیۃ لکتاب الجزائر۔ ص:٢٢٦

(٧)غرباوی، ماجد،(١٤٢٧ھ)، التسامح ومنابع التسامح فرص بین الادیان والثقافات، مدین، قم، ایران۔ ص٥

(٨)صلبیا ،الدکتور جمیل،(س۔ن)، المعجم الفلسفی، دار الکتاب البنانی، بیروت، لبنان۔١/٢٧٢

اقوام متحدہ (UNO)کے ذیلی ادارے یونیسکو (UNESCO) نے ۱۶ نومبر ۱۹۹۵ء کو ایک قرارداد منظور کی جس کے تحت ہر سال ۱۶ نومبر کو رواداری کا عالمی دن(World Tolerance day) منایا جاتا ہے اس قراد داد میں رواداری کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> "Tolerance is respect, acceptance and appreciation of the rich diversity of- our world's cultures, our forms of expression and ways of being human. It also means that one's views are not to be imposed on others."(9)

عصر حاضر میں مذاہب کے درمیان رواداری کی اصطلاح کا استعمال

عصر حاضر میں رواداری کی اصطلاح دنیا میں پائے جانے والے مختلف مذاہب، ادیان، عقائد و تصورات کے درمیان ہم آہنگی کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ کیونکہ زمانہ ماضی میں اس کی ضرورت اس قدر نہیں تھی جس کی وجہ مختلف ممالک اور سرحدوں کا اختلاف بعد المشرقین والمغربین کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر عصر حاضر میں دنیا سمٹ کر ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے۔ تنہا کسی ملک کے لیے زندگی گزارنا امر ناممکن بن چکا ہے۔ یا ماضی میں بڑی بڑی سلطنتیں تھی جو کہ اب مختلف ریاستوں اور ملکوں میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ پھر جدید ٹیکنالوجی کی ترقی نے فاصلوں کو کم سے کم کر دیا ہے۔ اسی لیے اسلام کے ابتدائی دور میں جہاں بھی رواداری(تسامح) کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں اس سے مراد آسانی، بردباری، سہولت، سخاوت لیا جاتا تھا۔ مگر اب یہ اصطلاح صرف مختلف مذاہب، ادیان، ممالک اور علاقوں کے باہمی میل جول اور روابط پر دلالت کرتی ہے۔ کہ کس طرح مختلف عقائد و نظریات کے حامل افراد ، معاشرے کے دیگر افراد کے مذہبی وسیاسی و علاقائی حقوق کو برداشت کرتے ہیں چنانچہ ماجد الغرباوی اپنی کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ”فمفهوم التسامح (Toleration) ظهر في القرن ۱۷-۱۸ ملتفا تداعيات الحروب والصراعات بين المذاهب والأديان والإتجاهات الفكرية والفلسفية المختلفة التي شهدتها أوروبا ابان القرون الوسط أو أيضاً من أجل التوصل إلى صيغ مناسبة

---

(9)https//www.un-documents/net/dpt/htm/

تضمن حقوق الإنسان وحرية الرأي والتعبير بشكل متبينا ولجميع أفراد الشعب، وذلک بعد إقصاء سلطة الكنيسة وإنهاء دور رجل الدين في الحياة السياسية . الآن ويراد بالتسامح : موقفا إيجابيا متفهما من العقائد والأفكار يسمح بتعايش الروي والاتجاهات المختلفة بعديداً عن الإحتراب والاقصاء''(۱۰)

''رواداری(Toleration) کا تصور ۱۷ویں اور ۱۸ ویں صدی میں اس وقت شروع ہوا۔جب مختلف ادیان اور مذاہب کی حامل اقوام جنگ کی ہولناک نتائج سے آگاہ ہوئیں۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب قرون وسطی میں یورپ کے اندر مختلف مذہبی افکار اور فلسفی مباحث پروان چڑھنا شروع ہوئے اس لیے مذہب کے پر تصادم ٹکراؤ سے بچنے کے لیے اھل چرچ نے اس پر غور کیا کہ کوئی ایسا طریقہ ہو جو انسانی حقو اور اظہار رائے کو مساوی طور پر تمام افراد تک پہنچائے یہ وہ دور تھا جب چرچ کے پادری سیاست پر اثر انداز ہونا شروع ہوئے تھے۔''

پس اب رواداری عقائد و افکار کی روشنی میں سمجھا جانے والا ایک ایسا عمل ہے جو صاف و شفاف اور جنگ و جدل سے پاک زندگی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

عصر حاضر میں بین المذاہب رواداری کی ضرورت واہمیت

کائنات ارضی میں پائے جانے والے مذاہب کے درمیان مفاہمت، مکالمہ، رواداری اور ہم آہنگی کی اصطلاح ایک عرصے سے زبان زد عام ہے۔ عمومی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان رواداری، ہم آہنگی اور مفاہمت کی فضا کو فروغ دینا ہر دور میں ضروری رہا ہے۔ مگر اب جب کہ فاصلوں کے مسلسل کم ہونے کے بعد دنیا ایک(Global Village) کی صورت اختیار کر رہی ہے تو اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کی جارہی ہے۔ تاکہ مختلف مذاہب، عقائداو رنظریات کے لوگ مل جل کر ایک سوسائٹی میں امن و محبت کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ اور مذاہب کے حوالے سے پائے جانے والے اختلافات کسی کش مکش اور تصادم کی صورت اختیار نہ کریں۔ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے

---

(۱۰)غرباوی، ماجد،(۱۴۲۷ھ)، التسامح ومنابع التسامح فرص بین الادیان والثقافات، مدین، قم، ایران۔ ص۵

درمیان کشیدگی اور تنازعات کے شدت پسندانہ اظہار کو بھی اس ضرورت کی ایک وجہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ماضی میں مختلف مذاہب کے درمیان تصادم، محاذ آرائی، قتل و غارت گری کا جو سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اس کا تسلسل آج بھی موجود ہے۔ عنوانات اور موضوعات تبدیل ہونے کے باوجود مذہبی شدت پسندی اور انتہاء پسندی بدستور انسانی معاشرے میں موجود ہے۔ لہذا رواداری کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی جاتی ہے کہ یہ مذہبی شدت پسندی، انتہاء پسندی اور دہشت گردی کے خاتمے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایسے معاشرے جن میں رواداری کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اسے معاشرے میں فروغ دیا جاتا ہے وہ ان معاشروں کی نسبت زیادہ خوش حال پرامن اور ترقی یافتہ ہیں جن میں رواداری کے کے وجود کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا جاتایا اس کی افادیت کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ذیل میں مختلف معاشرتی مسائل اور عنوانات کے تحت رواداری کی ضرورت اور اسکی اہمیت بیان کی جاتی ہے۔

١ - انسانی حقوق اور رواداری

انسانی معاشرہ بیک وقت وحدت وانتشار پر مشتمل ہے ۔ایک طرف افراد معاشرہ میں نسلی، مذہبی ، قومی جو مختلف ثقافتوں کی طرف رہنمائی کرتاہے تو دوسری طرف معاشرے کے افراد عزت ،احترام، برداشت اور رواداری کے ساتھ زندگی گزارتے نظر آتے ہیں ۔ان دونوں جہتوں کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ پہلو جو انسان کو ایک دوسرے کے قریب کرتے ہیں وہ ان پہلوو ں سے زیا دہ ہیں جو انسان کو ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز کرتے ہیں ۔ان اوصاف اور پہلووں میں سے ایک پہلو رواداری کا ہے۔ جو انسانی طبعیت میں تحمل، برداشت وسعت نظری اور کشادگی کا باعث اور موجب ہے۔ رواداری انسانی حقوق میں سے ایک حق ہے۔ جس کے وجود کی ضرورت مسلم اور امرواقعی ہے اور اس کی واضح دلیل اس زمین پر انسانی وجود کا گرد ہی شکل میں قیام اور اعتقادی فرق نظر آتا ہے۔جو مختلف ثقافتوں کی پذیر ہونا ہے۔اسلام رواداری ، برداشت، تحمل، وسعت اور کشادگی کا دین ہے اس نے انسانی معاشرے کی بقا اور پرامن نشوونما کے لیے رواداری کو نہ صرف ضروری قرار دیا ہے بلکہ اس کی ضرورت ان الفاظ میں بیان فرمائی:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾[١١]

---

(١١)سورۃ البقرۃ،٢/٢٥٦

"دین میں کوئی زبردستی نہیں"

مختلف مذاہب کے درمیان رواداری، ہم آہنگی اور مفاہمت کا لائحہ عمل بیان کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾(۱۲)

"آپ فرما دیں :اے اہلِ کتاب !تم اس بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے،) وہ یہ (کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہیں بنائے گا، پھر اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دو کہ گواہ ہو جاؤ کہ ہم تو اللہ کے (تابع فرمان) مسلمان ہیں۔"

نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ روادای کا عملی نمونہ ہے رواداری کی وہ مثالیں جن کا تذکرہ آج یورپ اور ترقی یافتہ ممالک میں بڑی تفصیل سے کیا جاتا ہے اسلامی تاریخ ساڑھے چودہ سو سال قبل اس کے عملی نمونے دنیا میں پیش کر چکی ہے۔اگر آج دنیا مختلف عالمی بحرانوں میں مبتلا ہے تو اس کی ایک وجہ رواداری کو فروغ نہ دینا بھی ہے۔اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے پرامن بقائے باہمی کے قیام اور فروغ کے لیے میثاق مدینہ، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ جیسے معاہدات و منشورات کو عملی صورت میں اس دنیا کے سامنے پیش کیا تاریخ انسانی قیامت تک رواداری ، برداشت،وسعت قلبی، کشادگی اور اعتدال پسندی کی ایسی لازوال مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام عالم نے اقوام متحدہ(UNO)کی بنیاد رکھی جس نے حقوق انسانی کا ورلڈ آرڈر دنیا کے سامنے پیش کیا اور پہلی مرتبہ رواداری کو انسانی حقوق میں جگہ دی۔ حقوق انسانی کے آرڈر ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء(The universal declaration of human Rights) کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے۔ کہ اس معاہدے میں جو انسانی حقوق بیان کیے گئے ہیں ۔اسلام نے قرآنی تعلیمات، اسوہ رسول اور سیرت صحابہ کی صورت میں ان کو ساڑھے چودہ سو سال قبل دنیا کے سامنے نہ صرف

(۱۲)سورۃ آل عمران،۳/۶۴

پیش کیا بلکہ عہد نبوی، خلافت راشدہ اور بعد کے اسلامی ادوار اس کی عملاً گواہی دیتے ہیں۔ اگر (UNO) کے حقوق انسانی کے چارٹر کو دیکھیں تو وہ صرف عالمی طاقتوں کے اردگرد گھومتا نظر آتا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ عصر حاضر میں بین المذاہب رواداری کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے برابری کی سطح پر اس کے عملی نفاذ کے لیے کوششیں کی جائیں۔ اقوام متحدہ کے Charter of the united nation)۲۶جون ۱۹۶۵ء) کے دیباچے کے دوسرے پیراگراف میں رواداری کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> "We the peoples of the united nations determined to practice tolerance and live together in peace with one another as good neighbours, and to unite our strength to maintain international peace and security."(13)

اسی طرح انسانی حقوق کے عالمی چارٹر The universal Declaration of human right 10 (december 1948)میں رواداری کی ضرورت واہمیت بیان کرتے ہوئے اس کے فروغ کے لیے تعلیم کو ضروری قرار دیاگیا کیونکہ تعلیم انسانی شخصیت میں شعور کو بیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے انسان معاشرے کے دیگر افراد کے ساتھ رواداری، ہم آہنگی اور باہمی احترام کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرتا ہے چنانچہ انسانی حقوق کے اس چارٹر کی شق ۲۶ کے الفاظ ہیں:

> "Education shall be directed to the full development of the human personality and to the strengthening of respect for human rights and fundamental freedom. It shall promote understanding, Tolerance and friendship among all nations, raeial or religious groups"(14)

(13) http//www.un.org/en/documents/charter/preamble

(14) ibid

"تعلیم کا بنیاد ہدف انسانی شخصیت کی کامل نشوو نما ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بنیادی انسانی حقوق اور آزادی کو فروغ دیتی ہے۔ یہ تمام اقوام، مذاہب اور گروہوں کے درمیاں رواداری، دوستی اور برداشت کے کلچر کے فروغ کے لیے اہم کردار ادا کرتی ہے۔"

اسکے علاوہ اس چارٹر کی ۱۳ویں شق کے پہلے پیراگراف میں مختلف ممالک کے ثقافتی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق کا بیان ہے۔ اور ممالک کے درمیان ان حقوق کی کما حقہ بجا آوری صرف رواداری سے ہی ممکن ہے اس شق میں درج ہے کہ:

"Everyone has the right to freedom of movement and residence with in the borders of each state " (15)

"مختلف ممالک کے افراد کو پڑوسی ملکوں میں آنے جانے اور وہاں رہنے کی اجازت ہے اور یہ ان کا حق ہے۔"

اس آرٹیکل کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ افراد معاشرہ کو اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق آزادی سے رہنے کی اجازت ہے۔ لیکن یہ حق بھی اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب مختلف مذاہب ،ادیان، ریاستیں اور ممالک ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کریں۔ رواداری، وسعت او رکشادگی کے ساتھ ایک دوسرے کو برداشت کریں۔ اور پرامن بقائے باہمی کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔

۲ - رواداری مسلمہ ضرورت ہے

سب سے پہلے اس بات کو تسلیم کرنا لازم ہے کہ بین المذاہب رواداری واقعی ایک چیز ہے اور اس کے وجو د کی ضرورت مسلم ہے۔ اور اس بات کا واضح ثبوت ہمیں زمین پر انسانی وجود کے گروہی شکل میں قیام پذیر ہونے سے ملتا ہے کہ تمام انسان بقاء، ضروریات زندگی، تہذیب و تمدن اور ترقی جیسے اہداف کے لیے مل جا کر رہنے کے حریص ہیں۔ اگرچہ ہر گروہ کی اپنی دینی، ثقافتی اور ماحولیات خصوصیات ہیں اور اس حقیقت کا واضح اعلان قرآن پاک نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾(۱٦)

---

(15) ibid

(۱٦)سورۃ الحجرات،۴۹/۱۳

بنیادی طور پر انسان آبادی میں رہنے کا حریص ہے۔ وہ اپنی زندگی کے اہداف کا حصول، اپنے معاملات، اپنی ذات کی تکمیل، اپنی صلاحیتوں کے اظہار ، خیرو شر سے نبرد آزما ہونا، محبت و بغض سے آشنائی، گندگی و نجاست کی حقیقت اور ان میں واضح فرق، بغیر مل جل کر رہنے کے نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ آبادی میں رہنے کا محتاج ہے اور اجتماعی زندگی کا حریص ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ انسان ماحول کا غلام یا فرزند ہے کیونکہ اس کی ضروریات اور تقاضا ہائے طبیعت کو پورا کرنے والا ماحول ہی ہوتا ہے چنانچہ زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے اور اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے رواداری کی ضرورت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔اور اس سے فراد کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔

۳-رواداری اور احترام باہمی لازم وملزوم

بین المذاہب رواداری اور تحمل و برداشت کا وصف اختلاف تنوع اور مغایرت کے عمدہ مثال پیش کرتا ہے یہ وصف افراد ، مذاہب عقائد و تصورات اور نفسیات کے مختلف ہونے کے باوجود انہیں احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مختلف اقوام کے جدید و قدیم تقاضوں اور ان کے امتزاج کی حد مقرر کرتا ہے جو ان کی بقا کیلئے ضروری ہے۔

۴-اختلاف دین ومذہب اور رواداری کا فروغ

بین المذاہب رواداری دوسرے کے وجود کو مطلقاً تسلیم کرنے کا نام ہے۔کیونکہ ہر ایک کو اس کے وجود اور بقا کی جنگ لڑنے کا حق حاصل ہے ہر ایک کیلئے اپنے دین کی آزادی ہے اگر کسی ایک کی ثقافت میں دوسرے کے لیے چند قابل اعتراض چیزیں ہیں تو دوسرے کی ثقافت میں بھی چند چیزیں ایسی ہیں جو قابل قبول اور اعتراض سے خالی ہیں ، مذاہب ، عقائد، نظریات و تصورات کا یہ فرق خالق کائنات کے وجود اور اس کی حقانیت پر دلالت کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے۔

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَى بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ٥وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ﴾(۱۷)

---

(۱۷)سورۃ ھود،۱۱/۱۱۷-۱۱۸

"اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ظلماً ہلاک کر ڈالے درآنحالیکہ اس کے باشندے نیکو کار ہوںo اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا) مگر اس نے جبراً ایسا نہ کیا بلکہ سب کو مذہب کے اختیار کرنے میں آزادی دی (اور) اب (یہ لوگ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔"

پس جب اختلاف رنگ و نسل ایک امر حقیقت ہے تو پھر اس حقیقت سے انکار کسی صورت بھی ممکن نہیں اور اس اختلاف کو سرے سے ختم کرنا کسی بھی طرح معاشرے کے کسی فرد، جماعت یا گروہ کے لیے ممکن نہیں اور نہ ہی یہ مطلوب ہے۔

۵ -اجتماعی زندگی کے قیام میں ہم آہنگی ورواداری کا کردار

یہ بات روز اول کی طرح عیاں ہے کہ بین المذاہب رواداری اور تحمل و برداشت کا مقصد ایک ایسی زمین کا قیام ہے جس میں اجتماعیت ہو، جمہوریت کا بول بالا ہو، انسانی فکر، رائے اور ثقافت کے اظہار اور ترویج کی آزادی ہو، قانون کی حکمرانی ہو حکمت عملی پر مبنی اختیارات ہوں انسانی قدریں افراط و تفریط سے پاک ہوں اور احترام باہمی کا وہ ماحول قائم ہو جس کا درس نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں دیا۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''أنتم بنو آدم وآدم من تراب''(۱۸)

''تم سب آدم علیہ السلام کی اولا د ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے تھے۔''

گویااقوام عالم کے درمیان رواداری کی بنیاد پر ایسا رشتہ قائم ہو جو ان کو باہم ایک دوسرے کے قریب لانے میں مدد گار ثابت ہو، افراد معاشرہ کے درمیان مصلحتوں اور منفعتوں کا تبادلہ ہو جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور نہ کوئی ایسا عمل کیا جائے جس سے معاشرے کے خیرو امن کا ماحول پراگندہ ہو۔

آج کا عالمی بحران مذہبی، سماجی، اقتصادی اور معاشی طور پر دنیا کو بری طرح متاثر کر رہاہے۔ جس کے باعث مختلف معاشروں میں بے چینی نفرت اور اضطراب کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے۔ افراد معاشرہ میں عدم رواداری کے سبب شدت پسندی اور انتہا پسندی کے رجحانات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ عدم رواداری کی وجہ سے تنگ نظری، بنیاد پرستی، فرقہ واریت، عدم برداشت اور بے جا آزادی اظہارِ رائے جیسی مذموم

---

(۱۸)ابوداؤد، سلیمان بن اشعث،(۱۹۹۴ء). السنن، تحقیق:شعیب الارنؤوط، دار الفکر، بیروت۔ ۴/۳۳۱،رقم:۵۱۱۶

روایات جنم لے رہی ہیں جو بعدازاں شدت پسندی اور انتہا پسندی اور دہشت گردی کے فروغ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اس بات کو اس خاکہ کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کس طرح عدم رواداری کا بیج، تنگ نظری، فرقہ واریت اور عدم برداشت کا درخت اگاتا ہے جو بعدا زاں افراد معاشرہ کو شدت پسندی، انتہاء پسندی اور دہشت گردی جیسے زہریلے پھل فراہم کرتا ہے۔

i. اگر انسانی طبیعت میں برداشت، تحمل، بردباری، وسعت قلبی، کشادگی جیسے اوصاف نہ ہوں تو اس کو عدم رواداری کہتے ہیں۔
ii. عدم رواداری کا وصف عدم برداشت کو جنم دیتاہے۔
iii. عدم برداشت کا رویہ انسان کو اعتدال کی راہ سے دور کرتا ہے۔
iv. وسط و اعتدال سے دوری تنگ نظری اور فرقہ واریت کو فروغ دیتی ہے۔
v. یہ تینوں اسباب یا ان میں سے کوئی ایک سبب انسانی طبیعت میں شدت پسندی کو جنم دیتا ہے۔
vi. شدت پسندی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کا سبب بنتی ہے جو معاشرے کی تباہی اور بربادی کا نقطہ اول ہے۔

٦ - عدم برداشت کا مسئلہ

عدم برداشت کا مسئلہ اس مادہ پرست دنیا کا المیہ ہے۔ یہ مرض انسان کو اس وقت لاحق ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی ذات اپنی نسل، اپنے رنگ، اپنے قبیلے کے حصار میں گرفتا ر ہو جاتا ہے۔ اور ان تنگ دائروں سے باہر کسی کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتاہے عصر حاضر کے مسائل میں عدم برداشت ایک ایسا رویہ ہے جس نے قوموں کے اخلاق کو کھوکھلا کر دیا ہے۔انسانی طبیعت و اخلاق میں اگرعدم رواداری ہو گی تو اس سے عدم برداشت جنم لیتاہے۔ جو فی زمانہ معاشرتی زندگی میں ظلم وستم فرقہ واریت اور فتنہ و فساد کی خشتِ اول ہے۔ یہ عدم برداشت ہی ہے جس کی وجہ سے دنیا میں مختلف نسلی، لسانی، مسلکی اور مذہبی گروہ آپس میں دست و گریبان ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات ہوں یا خودکش حملے غرض ہر جگہ انسانیت کا دامن خون سے تار تارہے۔ اور یہ سب عدم برداشت کا تحفہ ہے صرف ایک جنگ کے اعداد و شمار کا جائزہ لیں تو امریکہ کے سابقہ اٹارنی جنرل ریمزے کلارک(Ramsy clark)کے مطابق خلیجی جنگ کے دوران اور مابعد کے ۵ سالوں میں پانچ لاکھ افراد لقمہ اجل بن گئے اور یونیسف

(unicef)کی رپورٹ کے مطابق پانچ سال سے کم عمر کے جو بچے ہلاک ہوئے ان کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہے اس پر ریمز کلارک کے یہ الفاظ شاہد ہیں۔

"That is crime against humanity of enormous magnitude".(19)

"یہ انسانیت کے خلاف بہت بڑا جرم ہے۔"

اسلام وہ دین ہے جو برداشت کے اصولوں کو آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے بیان کر چکا ہے۔ قرآن پاک ہمیشہ تحمل برداشت کو بنیادی اصول کے طور پر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ" (عباد الرحمن)"یعنی اللہ کے بندوں کا تعارف قرآن پاک میں اس طرح کرایا گیا۔

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾(۲۰)

"اور) خدائے (رحمان کے) مقبول (بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب ان سے جاہل)اکھڑ (لوگ) ناپسندیدہ (بات کرتے ہیں تو وہ سلام کہتے) ہوئے الگ ہو جاتے ہیں۔"

اسی طرح لغویات یاطبیعت کے مخالف رویے کو برداشت کرنے کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾(۲۱)

"اور یہ (وہ لوگ ہیں جو کذب اور باطل کاموں میں) قولاً اور عملاً دونوں صورتوں میں(حاضر نہیں ہوتے اور جب بیہودہ کاموں کے پاس سے گزرتے ہیں تو) دامن بچاتے ہوئے (نہایت وقار اور متانت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ "

اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ﴾(۲۲)

---

(۱۹)ماہنامہ میثاق، مدیر، ڈاکٹر اسرار احمد، ، ۹ ستمبر ۱۹۹۵ء جلد:۲۰شمارہ: ۹ ص:۵۸

(۲۰)سورۃالفرقان،۲۵/۶۳

(۲۱)سورۃالفرقان،۲۵/۷۲

(۲۲)سورۃالقصص،۲۸/۵۵

"اورجب وہ کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال، تم پر سلامتی ہو ہم جاہلوں) کے فکر و عمل (کو) اپنانا (نہیں چاہتے) گویا ان کی برائی کے عوض ہم اپنی اچھائی کیوں چھوڑیں۔"

مظلوم کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک عدم برداشت کو رواج دیتا ہے۔ اگر صرف اسی بات کو یقینی بنا لیا جائے کہ مظلوم کا تعلق خواہ کسی مذہب ، مسلک، قوم یا نسل سے ہو اس کی بلا تفریق مدد کریں گے اور اس کے حقوق کا احترام کریں گے تو معاشرے میں برداشت کو احسن انداز میں رواج دیا جاسکتاہے۔

۷ -عدم برداشت اور تنگ نظری کا باہمی تعلق

تنگ نظری و بنیاد پرستی بھی عدم برداشت کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ جب انسانی طبیعت میں رواداری ، برداشت، تحمل وسعت قلبی جیسے اوصاف نہ پائے جائیں تو ایسے میں تنگ نظری و بنیاد پرستی جنم لیتی ہے۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے ۱۹ ویں صدی میں جنم لینے والی امریکی پروٹسٹنٹ تحریک کے لیے استعمال ہونا شروع ہوئی، بنیاد پرستی کا ترجمہ(Fundamentalism) کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ لاطینی زبان کے (Fundamentam) سے آیا ہے۔ جس کے معنی بنیاد کے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ مذہب کا تعلق، ۱۹۲۰ء اور بعض ذرائع کے مطابق ۱۹۱۰ء کے زمانے تک سے دیکھنے میں آرہا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ اصطلاح مذہبی مقالوں کے ایک مجموعے (The Fundamentals) سے اخذ کی گئی جو ۱۹۰۹ء کو امریکہ میں شائع ہوا۔ عمومی طور پر اس سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی گروہ ، تنظیم یاجماعت اپنے نظریات دوسروں پر زبردستی نافذ کرتی ہے۔ اور اپنے خیالات کے نفاذ کے متشددانہ راستہ اختیار کرتی ہے تو اسے بنیاد پرستی کہتے ہیں۔

"ماہنامہ تجزیات میں تنگ نظری کو ایسا وصف بیان کیا گیا ہے۔ جو عدم رواداری کے سبب جنم لیتا ہے۔ اور معاشرے کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ صاحب مضمون لکھتاہے کہ ایک عام معاشرہ کا ایک عام فرد کبھی تنگ نظری اور بنیاد پرست نہیں ہو سکتا بلکہ تنگ نظر اور بنیاد پرست بننے کے لیے درج ذیل امتحان سے گزرنا ہو گا۔میرا عقیدہ سچاہے، اور اس کے نفاذ کے لیے میں ہر حد تک جاؤں گا۔

i. قرآن کی صرف وہ تفسیر و تشریح سچی ہے جسے میرا مسلک، میرا نکتہ نظر اور دماغ قبول کرے۔

ii. میری تشریح اور تفسیر پر یقین نہ رکھنے والے، زندیق اور واجب القتل ہیں۔

iii. ریاستی امور، سرگرمیاں، قوانین، تقریریاں میرے خیالات کے مطابق ہونی چاہیں۔

iv. کتاب الہی کے سوا تمام تر علم و حکمت اور فلسفہ غیر متعلق ہے ایسے علم کو پھیلانا گمراہ کن اور بدتہذیبی ہے۔

v. رسوم اور تقریبات صرف وہ ہونی چاہیے جن کا درس قرآن سے ملتا ہے۔ اس درجہ بندی سے باہر، ہر تقریب ممنوع ہے۔

vi. دوسرے مذاہب کے مقامات عبادت کو تباہ کرنے اسلام کی زیادہ بہتر خدمت ہے۔

اسی طرح قاضی جاوید بنیاد پرست افراد کی نفسیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تنگ نظر اور بنیاد پرست وہ لوگ ہیں جو اپنے مذہبی عقائد میں معقولیت کی حد سے آگے نکل جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے عقائد دنیا میں سب سے زیادہ معقول اور سچے ہیں لہذا انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر دنیا پر ان عقائد کی بالادستی قائم کرنا لازمی ہے۔ اور اگر وہ مستقلا اسی راہ پر چلتے رہیں تو ایک قدم اور آگے نکل جاتے ہیں اور یہ دعوی کرتے ہیں کہ چونکہ صرف وہ حق پر ہیں لہذا دوسروں کو ان کی پیروی کرنا ہوگی۔ اور اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کرتے ہیں تو پھر ان کو بے راہ روی کی سزا بھگتنا ہوگی۔ اس کی ضد اعتدال پسندی اور میانہ روی ہے اور یہ رواداری کے جوہر سے جنم لیتی ہے۔"(۲۳)

اسلام تنگ نظری و بنیاد پرستی کا دین نہیں ہے بلکہ وسعت، کشادگی اور فراخدلی اس کے عملی شعائر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست کے غیر مسلم افراد اپنے مذہبی معاملات میں ہمیشہ پوری طرح آزاد رہے ہیں ۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں غیر مسلموں سے معاملہ کرتے وقت ہر موقع پر اس کی تاکید کی گئی کہ:

---

(۲۳)ماہنامہ تجزیات، مدیر محمد عامر رانا، تحریر، خالد احمد، اشاعت ۵ جنوری ۲۰۰۹ء، اشاعت اسلام آباد، ص،۵۷

"لا يغيرون عن ملة ولا يحال بينهم وبين شرائعهم" (۲۴)

"دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے مذہب کے کسی طریقے کو بدلنے کے لیے نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی مذہب پر عمل کے معاملے میں ان کے سامنے کسی قسم کی رکاوٹ کھڑی کی جائے گی۔"

اسلام کے ابتدائی دور میں اپنی حدود اقتدار میں مسلمانوں کا واسطہ زیادہ تر یہود و نصاریٰ سے رہا اسی لیے دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے سلسلے میں اسلام کی پالیسی اور رویہ ہمیشہ روادارانہ رہا ہے۔

۸ -فرقہ واریت کا رجحان

اسلام دین اعتدال ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسلام کا لغوی مفہوم ہی سلامتی، امن، سکون اور تسلیم ورضا ہے۔ رواداری، توازن و اعتدال مہذب انسانی معاشرے کی اعلیٰ خصوصیت ہے جہاں توازن واعتدال نہیں وہاں ظلم و تشدد، فرقہ بندی اور گروہی و مسلکی مفادات ہیں جس انسانی معاشرے میں رواداری کا وصف نہ ہو وہاں فرقہ واریت کا پودا بڑی آسانی سے اگتا ہے۔ انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف ویکی پیڈیا میں فرقہ واریت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"Sectarianism, according to one definition is bigotry, diserimination, or hatred arising from attaching importance to perceived differences between subdivisions with a group, such as between different denominations of a religion, class regional or factions of a political movement." (25)

"فرقہ واریت ایک تعریف کے مطابق، تعصب، امتیاز اور اس نفرت کو کہتے ہیں جو ایک مذہب، علاقے یا سیاسی تحریک کے اندر اختلاف کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔"

فرقہ واریت، گروہ بندی اور جماعت بندی کسی بھی مذہب علاقے یا سیاسی تحریک میں ہو سکتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے جس قدر فرقہ پرستی اور تفرقہ پروری کا زہر امت مسلمہ میں پایا جاتا ہے وہ کسی اور تحریک یا جماعت میں نہیں پایا

(۲۴) طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، (۱۴۲۷ھ)، تاریخ الرسل والملوک، دار المعارف، قاہرہ، مصر۔ ۴/۱۳۷

(25)http: www.en.wikipedia.org/wiki/sectarianism

جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اب یہ اصطلاح زیادہ تر مسلم ممالک میں استعمال ہوتی ہے۔ معاشرے کو صحیح خطوط پر منظم کرنے کی ذمہ داری من حیث القوم تمام امت پر ہے۔ کیونکہ اجتماعیت کا تصور اسلام کی فطرت کا جزو لا ینفک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا :

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾(۲۶)

"اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ مت ڈالو۔"

اسی طرح ملی شیرازہ کو تفرقہ و انتشار کے ذریعے تباہ کرنے والوں کے لیے حضور نبی اکرم ﷺ نے انتہائی سخت احکامات صادر فرمائے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

"من أتاكم وأمركم جميع على رجل واحد يريد أن يشق عصاكم أو يفرق جماعتكم فاقتلوه" (۲۷)

"جو شخص بھی تمہاری جماعت کی وحدت اور شیرازہ بندی کو منتشر کرنے کے لیے قدم اٹھائے اس کا سر قلم کر دو۔"

نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی فرقہ بندی کی شدید مذمت پر واضح دلالت کرتا ہے کہ یہ ایسا فعل مذموم ہے جس کی سزا موت سے کم نہیں۔ مگر افسوس ہم ان فرامین مقدسہ کو یکسر پس پشت ڈال چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زوال ہمارا مقدر بن چکا ہے۔ ۶۵۶ ہجری میں بغداد کی خلافت، تاتاریوں اور منگولوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی اس خلافت عباسیہ کی تباہی و بربادی کے دیگر اسباب میں سے ایک سبب اندرونی خلفشار اور فرقہ بندی بھی تھی۔ آج امت مسلمہ پھر اسی فرقہ واریت کے چنگل میں پھنس چکی ہے۔ اور اس کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہمارے رویے میں عدم رواداری کا نہ پایا جانا ہے۔ تحمل برداشت، رواداری جیسے اعلیٰ اوصاف ہمارے معاشرے سے رخصت ہوتے جارہے ہیں جن کی وجہ سے آئے دن فرقہ وارانہ تشدد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

۹ -برداشت، رواداری اور شدت پسندی کا باہمی تعلق

عدم رواداری جب ہمارے معاشرتی وجود کا حصہ بن جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں شدت پسندی پیدا ہوتی ہے۔ شدت پسندی کے پنپنے اور فروغ پانے میں یقیناً دیگر عوامل بھی کارفرما ہیں۔ مگر ان میں عدم رواداری کے عنصر کو

(۲۶) سورۃ آل عمران، ۳/ ۱۰۳

(۲۷) مسلم، مسلم بن الحجاج، (۲۰۰۳ء)، الصحیح، دار الفکر، بیروت، لبنان-۳/ ۱۴۸۰، رقم: ۱۸۵۲

بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ جہاں دیگر عوامل انسانی طبیعت میں شدت اور غلو کو جنم دیتے ہیں وہاں رواداری، تحمل، برداشت کا نہ پایا جانا بھی اہمیت کا حامل ہے عمومی طور پر شدت پسند اس فرد کو کہتے ہیں جو اپنے نظریے، سوچ، فکر، عقیدے اور مذہب کو برحق سمجھتا ہے اور اس فکر کو دوسرے پر لاگو کرنے میں شدت اور غلو کو درست اور جائز سمجھتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کی تعریف کے مطابق :

"The term Radical (from the latin word radix meaning root) was used during the late 18th century in a political sense" (28)

"شدت پسندی کے لیے بنیاد پرستی اور Radicalism کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ "Radical" ایک لاطینی لفظ ہے۔ جو Radix سے اخذ شدہ ہے۔ اور اس کا معنی ہے جڑ، اور اس لفظ کو ۱۷۹۷ء میں پہلی مرتبہ Great Britain کی سیاست میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور سیاست میں اس لفظ سے مراد Liberalism لیا جاتا ہے۔ یعنی جمہوری اقدار کو قبول نہ کرنے میں سخت اور متشددانہ رویہ اختیار کرنا شدت پسندی کہلاتا ہے۔"

پاکستان انسٹیٹوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS) نے شدت پسندی کی جدید تعریف میں کہا کہ شدت پسندی مثبت بھی اور منفی دونوں پہلوؤں سے ہو سکتی ہے اگر کوئی شخص کسی مثبت انداز فکر میں شدت اختیار کرتا ہے اور اس کو لاگو کرنے کی سعی کرتا ہے تو یہ بھی شدت پسندی کہلاتی ہے۔ گویا اس کا طرز تفکر درست اور مثبت ہو گا مگر اس کو لاگو کرنے کے لیے اگر وہ شدت اختیار کرے گا تو یہ شدت پسندی کہلائے گی۔ محققین اور ماہرین نے شدت پسندی کے عمل کو انتہاء پسندی اور دہشت گردی سے الگ طور پر دیکھنے کی شعوری کوشش کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مثبت اور منفی دونوں مفاہیم کا تعلق شدت سے ہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شدت پسند، انتہاء پسند یا دہشت گرد نہیں ہو سکتے۔ شدت پسندی ایک ایسا رویہ ہے جو انتہاء پسندی کو پیدا کرتا ہے اور یہ کسی بھی مسئلہ پر منطقی یا انتہاء پسندانہ فکر کو قبول کرنا یا اخذ کرنا ہو سکتا ہے۔ فاضل مصنف مجتبیٰ محمد نے اپنی کتاب میں شدت پسند افراد کا طرز تفکر اور ان کے اقدامات و مقاصد کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شدت پسندی ایک ایسا عمل ہے جس میں لوگ انتہاء پسندانہ نظریات اختیار کرتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ سیاسی اور مذہبی مقاصد کے حصول کے لیے پر تشدد اقدامات کرنا ضروری ہیں۔ شدت پسندی کا نظریہ، عسکریت

---

(28)http:www.en.Wikipedia.org/viki/Radicalism

پسندی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ماہرین علوم سماجیات کہتے ہیں کہ کوئی بھی معاشرہ جب لسانی، نظریاتی، سیاسی، معاشی، اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم ہوتا ہے تو اس میں شدت پسندی کے رجحانات شامل ہو جاتے ہیں۔ شدت پسندانہ رویے اور آراء علاقائی اعتبار سے منقسم ہیں۔ بعض اوقات ایک علاقے میں پائے جانے والے شدت پسندانہ رجحانات اور اس کے خدوخال دوسرے علاقے میں پائے جانے والے رجحانات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ جبکہ بعض اوقات یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ کسی بھی ملک اور معاشرے میں پائی جانے والی شدت پسندی کی بنیادی وجوہات میں، سیاسی معروضی حالات، غربت، معاشی استحصال، عدم مساوات، سماجی ناانصافی، فرقہ وارانہ تقسیم، جاہلیت، نظام تعلیم کی خامیاں، مدارس کے نصابات کی عدم اصلاح اور شدت پسند تنظیموں کے جابرانہ مقاصد شامل ہیں۔ جن سے ان مظاہر کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے۔"(۲۹)

مجتبی محمد لکھتے ہیں:

شدت پسند کے لیے یہ مندرجہ بالا عوامل مہمیز ثابت ہوتے ہیں کوئی بااثر شدت پسند جماعت ان میں سے کسی ایک عامل پر توجہ مرکوز کرتی ہے، اور اس کے ذہن میں معاشرے سے بغاوت کے خیالات کو ابھارتی ہے۔ اور جذبہ انتقام کے لیے دین کو استعمال کرتی ہے۔ بعد ازاں وہ معصوم ذہن، دیکھتے دیکھتے شدت پسند بن جاتا ہے۔ ان عوامل کے ساتھ ساتھ اگر انسانی فطرت میں رواداری، تحمل، برداشت پیدا ہو جائے تو اس شخص کا شدت پسندی کی طرف راغب ہونے کا امکان کم ہوتا ہے۔ اگر رواداری اور پر امن بقائے باہمی کو فروغ دیا جائے تو معاشرہ امن و امان کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ اگر رویوں میں مثبت تبدیلی لائی جائے تو معاشرے سے شدت پسندی کے رجحان میں خاطرہ خواہ کمی واقعہ ہوگی کیونکہ کسی بھی معاشرے میں انسانی رویے اور سماج کی ترقی آپس میں مربوط ہوا کرتے ہیں اور انہیں الگ الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا جیسا کہ ۱۹۲۵ء میں مغربی مفکر کالہون(Calhoan) نے لکھا تھا۔

"سماجی نظام ہی ایک حقیقی نظام ہے اور یہ متعصبانہ تقسیم کا حصہ نہیں ہے۔"(۳۰)

مذاہب کے سیاسی تنوع اور اس سے وابستہ ہیجان انگیز صورت حال کو انتہاء پسندی کی اصطلاح سے جانا جاتا ہے دانشوروں اور ماہرین کے مطابق انتہاء پسندی ایک ایسا طرز عمل ہے جو معاشرتی بے سکونی کا باعث بنتا ہے۔

انگلش انسائیکلوپیڈیا، آف ویکیپیڈیا میں انتہاء پسندی (Extremism) کے بارے میں درج ہے کہ:

---

(29)http:www.pips.org.pk/publications.html/

(۳۰)راٹھور، مجتبی محمد، (۲۰۱۱ء)، پاکستان میں شدت پسندی، narrative.pvt.Ltd، اسلام آباد۔ ص:۱۳

"Extremism is a complex phenomenon, although its compexity is often hard to see. Most simply, it can be defined as activities(beliefs, attitudes, feelings, actions, strategies) of a character far removed from the ordinary."(31)

"انتہاء پسندی ایک پیچیدہ طبعی عمل ہے۔ اگرچہ اس کی پیچیدگی اکثر نظر نہیں آتی تاہم عام اور سادہ الفاظ میں اس کی تعریف یہ ہے کہ انتہاء پسندی ایک ایسے کردار کا نام ہے جو معمول کے رویے سے ہٹ جائے۔ یہ کردار خواہ مذہب میں ہو احساس، عمل یا حکمت عملی میں ہو اور انتہاء پسندی ایک ایسا منفی عمل ہے جس میں مثبت پہلوؤں کو تلاش کرنا ایک احمقانہ عمل ہے۔"

اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انتہاء پسندی وہ طبعی عمل ہے جو شدت پسندی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر شدت پسندی کا بروقت تدارک نہ کیا جائے تو وہ لمحوں میں انتہا پسندی میں بدل جاتی ہے۔ انصاف کا نہ ہونا، غربت، فرقہ واریت کے رجحانات، عدم برداشت یہ وہ سارے عوامل و محرکات ہیں جو انتہا پسندی کو فروگ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر انسانی طبیعت میں برداشت، رواداری، تحمل، وسعت وکشادگی جیسے اوصاف ہوں تو انتہاء پسندی کا بروقت خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۰ - انتہا پسندی، دہشت گردی کی بنیاد ہے

دہشت گردی (Terrorism) کی ابھی تک کوئی جامع تعریف سامنے نہیں آسکی، مختلف ماہرین نے اس کی تعریف کرتے ہوئے الگ الگ الفاظ استعمال کیے ہیں کیونکہ وقت اور جگہ کے ساتھ ساتھ اس کی تعریف میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ دہشت گردی کی جامع انداز میں تعریف اس لیے بھی مشکل ہے کہ مختلف جگہوں اور موقعوں پر اس کو مختلف انداز سے پہچانا جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر جگہوں پر دہشت کو قبول کرنے یا دہشت زدہ ہونے کی شدت کا معیار الگ الگ ہوتا ہے۔ فاضل مصنف میاں علاؤ الدین دہشت گردی کے ذیل میں مختلف نظریات کا تجزیہ درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

(31)http:www.en.wikipedia.org/viki/extremism/

"ایک طبقہ فکر کے نزدیک: دہشت گردی اتنی ہی پرانی ہے جتنی آدمیت، یہ انسان کی جبلت میں شامل ہے اور جب بھی اس کی یہ جبلت بیدار ہوتی ہے وہ دہشت گردی کرتا ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ یہ عین فطرت کے خلاف ہے انسان کی فطرت شدت پسند یا انتہاء پسند نہیں ہوتی ہر انسان اپنی فطرت میں نرم خو اور نرم مزاج ہوتا ہے۔ لیکن بعد ازاں معاشرتی عوامل اس کی فطرت کو تبدیل کرتے ہیں آج دنیا میں جتنے بھی دہشت گرد پائے جاتے ہیں ان میں سے اکثریت ان افراد کی ہے جو معاشی طور پر مضبوط و مستحکم نہیں۔ غربت سے دو چار ہیں۔ اور ایسے افراد بآسانی کسی ایک تنظیم یا جماعت میں چند پیسوں کے عوض شامل ہو جاتے ہیں جو دہشت گردی کی کاروائیاں کرتی ہے۔"(۳۲)

اسی طرح کچھ لوگوں کے خیال میں دہشت گردی، حکومت کی ناقص پالیسوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اگر حکومت اپنی پالیسوں میں مخلص ہو تو اس سے معاشرے میں امن وسکون پیدا ہو سکتا ہے۔ جبکہ تعلیم یافتہ طبقے کے نزدیک دہشت گردی کی وجہ معاشرتی ناانصافی اور مذہب کی غلط تعبیر و تشریح ہے دہشت گردی سے نجات کیسے ممکن ہے اس کے بارے میں اخلاقیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ لوگوں میں نفرت کو کم کیا جائے اور برداشت، رواداری، تحمل جیسے رویوں کو فروغ دیا جائے تو دہشت گردی سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

بعض دینی اداروں اور مدارس میں طلباء کو دیگر مسالک کے خلاف نفرت، عدم رواداری اور انتہاء پسندی پر مبنی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس سے وہ طلباء کسی دوسرے مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد کو غیر مسلم اور گمراہ سمجھتے ہوئے نفرت کا بیج بوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے یہ طلباء تنگ نظری، عدم رواداری اور فکری مغالطوں کا شکار ہو کر اپنے علاوہ سب کو کافر، مشترک اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے لگتے ہیں بات صرف یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ بعض افراد شدت پسندی سے انتہاء پسندی اور انتہاء پسندی سے دہشت گردی کی طرف راغب ہوتے ہیں اور پھر خونِ ناحق بہانا نہ صرف جائز بلکہ واجب سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں رواداری، تحمل، برداشت کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے تاکہ شدت پسندی اور انتہاء پسندی کے ساتھ ساتھ دہشت گردی سے نجات حاصل کی جاسکے۔

خلاصہ بحث

رواداری کی اصطلاح ۱۸ویں صدی عیسوی کے آخر میں ظاہر ہوئی اس سے پہلے یہ لفظ اپنے موجودہ معنی و مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا تھا اس اصطلاح کو ۲۰ویں صدی میں مذاہب کے ساتھ استعمال کیا جانے لگا جب سائنسی ترقی کی بدولت فاصلے کم ہونے لگے اور مختلف مذاہب کے افراد ایک دوسرے کے قریب آئے تو معاشرے میں امن و

(۳۲) علاؤالدین، (س۔ن)، دہشت گردی ایک مسلسل خطرہ اور اس کے اثرات، علم و عرفان پبلی کیشنز، لاہور۔ ص:۸۵

امان کی فضا بر قرار رکھنے کے لیے، رواداری کا لفظ اور اصطلاح زبان زد عام ہونے لگے۔ رواداری بنیادی طور پر انسانی طبیعت میں پایا جانے والا ایک ایسا وصف ہے جو برداشت، تحمل، عفو در گزر، وسعت، کشادگی اور لطف و کرم جیسے اخلاق حمیدہ کو فروغ دینے کا باعث بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رواداری کا معنی سخاوت، کرم، مہربانی اور لین دین میں کشادگی اور نرمی کیا جاتا ہے۔ رواداری کی صفت کو مذہب کے ساتھ خاص کرتے ہیں تو اس کا معنی مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان تحمل، برداشت، وسعت قلبی، کشادگی، اعتدال پسندی اور میانہ روی کے ساتھ باہم معاملہ کرنا ہے۔

عصر حاضر میں جب رواداری کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ تو یہ اہل مذاہب کے تعلقات کو مختلف جہتوں سے بیان کرتی ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی ضرورت و اہمیت زمانہ ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ محسوس کی جارہی ہے۔ کیونکہ ماقبل کے زمانے میں ذرائع نقل و حمل کی اتنی ترقی نہیں تھی مگر جدید ٹیکنالوجی نے دنیا کو (Global village) بنادیا۔ جس کی وجہ سے مختلف ممالک اور مذاہب کے افراد پہلے کے مقابلے میں ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ چنانچہ مختلف مذاہب اور اعتقاد و نظریات کے پیروکاروں میں میل جول اور باہمی روابط بھی زیادہ ہوگئے۔ جس کی وجہ سے رواداری کی ضرورت پہلے ادوار کی نسبت زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔ مذہب کی غلط تعبیر و تشریح کی وجہ سے شدت پسندی، انتہاء پسندی اور دہشت گردی جیسے مذموم اور قبیح افعال معاشرتی امن کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ رواداری ہی وہ صفت ہے جس کو فروغ دے کر ان معاشرتی مسائل سے چھٹکارہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

۱. القرآن الکریم

۲. احمد بن حنبل،(س۔ن)،المسند،موٴسسہ قرطبہ،مصر۔

۳. ازہری، ابو منصور محمد بن احمد،(۲۰۰۱ء)،تہذیب اللغۃ، داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان

۴. ابوداوٴد، سلیمان بن اشعث،(۱۹۹۴ء). السنن، تحقیق:شعیب الارنؤوط،دارالفکر،بیروت

۵. راٹھور، مجتبی محمد،(۲۰۱۱ء)،پاکستان میں شدت پسندی، narrative.pvt.Ltd،اسلام آباد

۶. طبری،ابوجعفر محمد بن جریر،(۱۴۲۷ھ)،تاریخ الرسل والملوک،دارالمعارف،قاہرہ،مصر

۷. ابن عاشور، امام محمد الطاہر،(س۔ن)، اصول النظام الاجتماعی فی الاسلام، طبع ثانی، الموٴسسۃ الوطنیۃ لکتاب الجزائر۔

۸. علاوٴالدین،(س۔ن)،دہشت گردی ایک مسلسل خطرہ اور اس کے اثرات،علم و عرفان پبلی کیشنز،لاہور

۹. صلیبا ،الدکتور جمیل،(س۔ن)، المعجم الفلسفی،دارالکتاب البنانی، بیروت، لبنان

۱۰. غرباوی،ماجد،(۱۴۲۷ھ)،التسامح ومنابع التسامح فرص بین الادیان والثقافات، مدین، قم،ایران

۱۱. ماہنامہ میثاق، مدیر، ڈاکٹر اسرار احمد، ، ۹ ستمبر ۱۹۹۵ء جلد:۲۰شمارہ: ۹

۱۲. ماہنامہ تجزیات،مدیر محمد عامر رانا، تحریر،خالد احمد،اشاعت ۵ جنوری ۲۰۰۹ء،اشاعت اسلام آباد

۱۳. مولوی فیروز الدین،(س۔ن)، فیروز اللغات اردو، فیروز سنز، اردو بازار ,لاہور۔پاکستان

۱۴. مسلم، مسلم بن الحجاج،(۲۰۰۳ء)،الصحیح، دارالفکر،بیروت،لبنان

15. Jonathan Crowther, (1995), Oxford Advanced learner's Dictionary, Oxford University New York
16. https//www.un-documents/net/dpt/htm/
17. http//www.un.org/en/documents/charter/preamble
18. http:www.en.Wikipedia.org/viki/Radicalism
19. http:www.pips.org.pk/publications.html/
20. http:www.en.wikipedia.org/viki/extremism/
21. http: www.en.wikipedia.org/wiki/sectarianism

خواتین کی سماجی زندگی پر حقِ وراثت کے اثرات

(تحقیقی سروے رپورٹ کی روشنی میں)

The effects of the right to inheritance upon the social life of women

☆ مسرت ملک

☆☆ ڈاکٹر منظور احمد الازہری

ABSTRACT

Women rights of inheritance have been provided by Islam and Pakistani law also ensures its application. As far as the society is concerned, it is presenting such a situation in which Islamic teachings are not being practised and implementation of law is not fully taken into practical accounts. To know the causes of this exploitation, this survey was conducted so that the real scenario of society can be presented in with the help of well-organized and exact facts and figures. Before going for survey, the researcher had tried to look into the previous researches and those have been summarized in the first part of the article. Consequences of denial of women from their right of inheritance are also described. Later the details of current survey are places and then the results are presented.

Keywords: Women, Inheritance, Islam, Law, Pakistan, Society

عہد جاہلیت میں خواتین کو وراثت میں سے حقوق نہیں دیے جاتے تھے۔فوت شدہ کا کل ترکہ اس کے مرد ورثا میں تقسیم کیا جاتا تھا۔اس کا سبب یہ تھا کہ اہل عرب میں جانشینی کا تصور قبائلی اعتبار سے محض مرد تک محدود تھا۔[۱]

ابن جشم نے مردوں اور عورتوں کو برابر کا حصہ دینے کا قانون وضع کیا جس پر کچھ عرصہ عمل بھی ہوا لیکن بعد میں اس کو ترک کر دیا گیا۔[۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے قبل شریعتوں میں خواتین کے وراثتی حقوق یا تو سرے سے موجود ہی نہیں تھے یا انتہائی ناانصافی اور استحصال پر مبنی تھے۔مدنی دور میں حضرت سعد بن ربیع ﷺ کی

☆ پی۔ایچ۔ڈی اسکالر،ہائی ٹیک یونیورسٹی، واہ کینٹ

☆☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر،ہائی ٹیک یونیورسٹی، واہ کینٹ

(۱) محمد صدیق خان،(س۔ن)،جدید دنیا میں اسلامی قوانین اور خواتین، بین الاقوامی کانفرنس، جائنٹ فورم، اسلام آباد۔ص ۱۸۲

(۲) اصغر حسین دیوبندی،(۱۳۴۹ھ)، مفید الوارثین، دہلی، انڈیا۔ج۱،ص ۱۹

شہادت کے بعد ان کا کل مال ان کے بھائی نے لے لیا۔ حضرت سعد ؓ کی دو بیٹیاں تھیں۔ان کی بیوہ نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس مسئلہ کا حل اللہ تعالیٰ نازل فرمائے گا۔ چنانچہ میراث کی آیت (۱) نازل ہوئی تو پھر آپ ﷺ نے ایک شخص کو سعد کے بھائی کی طرف بھیجا اور دونوں بیٹیوں کو کل جائیداد کے دو دو حصے اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دینے کے بعد باقی مال سعد کے بھائی کے حوالے کر دیا۔ (۲) عورت کو وراثتی حقوق دینے کا اسلام میں یہ پہلا واقعہ تھا۔اس کے بعد خواتین کے حقوق وراثت کا مستقل تعین کر دیا گیا تھا۔

ا - خواتین کی سماجی زندگی پر حقِ وراثت کے اثرات:

خواتین کی سماجی و معاشی زندگی میں بہتری لانے کے لیے اس مال کا انتہائی اہم کردار ہے جو انہیں وراثت کے طور پر ملتا ہے۔ منقولہ و غیر منقولہ جائیداد میں سے حصہ نہ صرف ان کی مالی اعانت کا سبب بنتا ہے بلکہ ان کے لیے سماجی تحفظ کا جامن بھی ہے۔

جنوبی ایشیا میں خواتین کے وراثتی امور سے متعلق ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق وراثت کا حق عورتوں کی فلاح، بہتری، مساوات اور ترقی کا ضامن ہے اور اسی ضمانت کی اہمیت و افادیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ متعلقہ ادارے ہمہ وقت اس کو عملی طور پر یقینی بنانے کی غرض سے فعال رہیں۔ زمین پر عورتوں کی ملکیت کا حق تصور کر لینے کے بعد نہ صرف گھر میں بلکہ معاشرے میں ان کی اہمیت مردوں کے برابر تسلیم کی جا سکتی ہے۔ ان کا مال ان کے لیے بھی اتنا ہی مفید اور نفع بخش ہو سکتا ہے جتنا مردوں کے لیے ہو سکتا ہے۔ زمین ایک پیداواری اثاثہ ہے کیونکہ اس سے مزید مال پیدا کیا جا سکتا ہے۔ (۳)

دنیا میں نصف آبادی خواتین کی ہے اور بقیہ نصف آبادی بھی بلا واسطہ یا بالواسطہ انہی پر منحصر ہے۔ تہذیبوں کی ترقی میں ان کے بنیادی کردار کے باوجود دنیا کے متعدد حصوں میں ان کا مقام مردوں کے مساوی نہیں ہے اور نہ ہی انہیں وہ عزت و احترام حاصل ہے جو مردوں کو دیا گیا ہے۔ (۴)

---

(۱) سورۃ النساء، ۴/ ۷-۸

(۲) ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، (۱۹۹۴ء)، السنن، تحقیق: شعیب الارنؤوط، دار الفکر، بیروت۔ ۳/ ۱۲۰، رقم: ۲۸۹۱

(3) Bina Agarwal,(1998), Widows versus Daughters or Widows as Daughters? Property, Land and Economic Security in Rural India, Journal of modern Asian studies, p:32

(4) M. Hammadur Rahman, Kazi Naoroze, (2007), Women Empowerment through Participation in Aquaculture, Journal of Social Science 3 (4): 164-171

خواتین کے پاس جائیداد، مال، تعلیم، مہارت، ملازمت اور زمین کے حصول کے محدود ذرائع ان کے مقام ومرتبے کو بڑھادیتے ہیں۔ ورلڈ بینک کی رپورٹ کے مطابق دنیا کے تقریبا چار ارب لوگ خط غربت پر یا اس سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں جن کی دو تہائی عورتوں پر مشتمل ہے۔[1] یہی وجہ ہے کہ خواتین مردوں کی نسبت زیادہ کام کرتی ہیں لیکن وہ مال کم کماتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کام کا تقریبا ساٹھ فیصد حصہ ایسے کاموں پر مشتمل ہے جس کی کوئی تنخواہ نہیں ہے۔ دوسری جانب سخت اور جفاکشی کی زندگی گزارنے کے باوجود دنیا میں موجود املاک کا انتہائی کم حصہ ان کی ملکیت میں ہے۔

ا- خواتین کا کم تر معاشرتی مرتبہ:

ہمارے معاشرے میں وراثتی حقوق براہ راست خواتین کے مقام کے ساتھ مربوط ہیں۔ جن خواتین کو ان کے والدین کی جانب سے وراثت میں سے حصہ مل جاتا ہے وہ بہتر سماجی مقام کی مالک ہیں کیونکہ ان کی معاشرتی تقویت میں بنیادی کردار ادا کرنے والے عناصر میں سے وراثت کا اولین کردار ہے۔ اس طرح خواتین کو وراثت میں سے جتنا زیادہ حصہ ملے گا ان کا سماجی مرتبہ اتنا ہی ارفع ہوگا جب کہ جن خواتین کو ان کے حق کا معمولی حصہ دے کر ٹرخا دیا جائے ان کی شخصیت مسائل کا شکار ہو سکتی ہے۔ پنجاب میں عورت کے لیے بوقت رخصتی جہیز اپنے ساتھ لانا ضروری سمجھا جاتا ہے اور سسرال میں اس کے بغیر اس کی ازدواجی زندگی کی بقا خطرے میں ہوتی ہے۔ اگر جہیز کے ساتھ ساتھ وراثت میں سے حصہ مل جائے تو اس کو زیادہ بہتر سمجھا جاتا ہے اور اس سے خاتونِ خانہ کا مرد پر انحصار کم ہو جاتا ہے۔ جہیز کے سامان اور وراثت کی ملکیت کی بنا پر اس کو سسرال میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اس حوالے سے ۱۲۰۰ شادی شدہ خواتین کے خیالات پر مشتمل Paul Bate کی ایک سروے رپورٹ سامنے آئی ہے جس کے مطابق سسرال میں جہیز اور مال وزر نہ لانے والی خواتین کو وہ مقام ومرتبہ نہیں دیا جاتا جس کی وہ توقع کرتی ہیں۔ اسی بنا پر وہ سسرال میں قابلِ رحم حد تک بے چارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور پائی گئیں۔[۲]

ایک دوسری رپورٹ کے مطابق زمین کی مالک خواتین کو ان کے خاندان کے مردوں میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس مثبت رویے کی وجہ سے ان کی شخصی اہمیت اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ نیز ان علاقوں میں

([1]) Uttar Pradesh, Poverty, Growth and Inequality" (PDF). worldbank.org. World Bank Group. Retrieved 15 July 2019.

([2]) Paul Bate, (1990), Using the culture concept in an organization development setting, Journal of Applied Behavioral Science, P. 83-106

خواتین معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی اعتبار سے زیادہ مضبوط ہیں جہاں ان کے وراثتی حقوق ان کو دینے میں کسی قسم کی ناانصافی کا ارتکاب نہیں کیا جاتا ہے۔ (۱)

اس کے برعکس وہ خواتین جن کو جہیز یا وراثت کا حق نہیں ملتا ہے بلکہ ان کے بھائی اور دیگر مرد حضرات ان کے حق پر قبضہ کر لیتے ہیں ان کو سسرال میں ہر قدم پر طعنے سننے پڑتے ہیں، تحقیر کو برداشت کرنا پرتا ہے نیز ان کے شوہروں کی جانب سے ان کو قطعی طور پر کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ (۲)

۲ - مردوں پر کلی انحصار:

جن معاشرون میں عورتوں کو حقِ وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے وہاں مرد شاہی نظام مروج ہے اور خواتین کو زندگی کے ہر معاملے میں مردوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔یقینا مرد ہر صورت میں اپنی اجازرہ داری کو قائم رکھنے کی کوشش میں مگن ہیں اور اس ضمن میں وہ خواتین کے حق کا استحصال کرنے میں میں بھی تردد نہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نظام کی بقاکے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں جو نہ صرف عورتوں کے حق میں مضر ہیں بلکہ مجموعی طور پر معاشرتی نظام کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ عورتوں کی شادیاں اپنے ہی خاندان میں کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے تاکہ خاندانی زمین تقسیم نہ کی جائے اور وہ باہر نہ جا سکے۔اس لیے یہاں شادی اور نکاح کا مقصد نسلِ انسانی کو آگے چلانا یا خواتین کا گھر آباد کرنا نہیں بلکہ جائیداد کو محدود افراد کے قبضے میں رکھنا ہے۔یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر عورتوں کی شادیاں کرتے ہوئے خاندان کے مردوں کے ساتھ ان کی برابری اور ہمسری کو بھی نہیں دیکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے عورتوں کی ازدواجی زندگی مسائل میں گھر جاتی ہے۔

اس ضمن میں ۲۰۰۶ء میں شائع ہونے والی ایک سروے رپورٹ کے مطابق خواتین کے معاشی مسائل کو سامنے لاتے ہوئے یہ واضح کیا گیا کہ مردوں کی حاکمیت کے مروج ہونے کی بنا پر متمول خاندانوں کی عورتوں کو بھی اسی طرح مالی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس طرح غریب خواتین کو کرنا پرتا ہے۔ جن خاندانوں کی خواتین کا حق، ملکیت محفوظ ہے وہاں عورتوں کو اپنے اور اپنے بچوں کے اخراجات چلانے کے لیے چونکہ مردوں پر انحصار نہیں کرنا پڑتا اس لیے وہ آزادانہ طور پر اپنی ضروریات کو پورا کرنے پر قادر ہیں۔

---

(1) Clement Allan Tisdell, K.C. Roy, Property rights in women's empowerment , International Journal of Social Economics, April (2002), Vol 29(4), P. 315-334 ·

(2) Atif Abbasi, Saqib Hameed, Asif Iqbal, Amber Arooj, Wafa Hussain, Sheeba Arooj, (2013), Paid Work & Decision Making Power of Married Women Cross Sectional Survey of Muzaffarabad Azad State of Jammu & Kashmir, Journal of Advances in Applied Sociology, June 28, Vol.3 No.3

۳ - بے اختیاری:

پیسہ سماجی رتبے کا تعین کرتا ہے۔جس شخص کے پاس کم مقدار میں مال ہو اس کا معاشرتی رتبہ زیادہ مالدار شخص کی نسبت کم تر ہوتا ہے۔کسی بھی مالی چیز پر ملکیت کا اختیار سماجی سطح پر کئی معاملات میں طاقت کے حصول کا سبب بن سکتاہے۔طاقت اور معاشرے کے مابین ایک متوازن ربط قائم کرنے میں جائیداد کا بنیادی کردار ہے۔

International Fund For Agricultural Development (IFAD) کی سروے رپورٹ کے مطابق خواتین کو تعلیم، صحت اور غیر مادی سہولیات کی فراہمی زمینی وراثت کی فراہمی سے زیادہ آسان ہے۔اول الذکر کی فراہمی ان کی زندگی میں بہتری پیدا کر سکتی ہے جب کہ جائیداد کی فراہمی ان کی معاشرتی اور سماجی طاقت میں اضافہ کرتی ہے۔سیاسی، اقتصادی اور سماجی طاقت بالعموم ایک دوسرے کے متوازی ہوتی ہیں۔جائیداد میں سے زمین کی ملکیت سے زراعت یا ٹھیکے کے ذریعے خواتین کے پاس مزید اکتسابِ مال کے وسائل دستیاب ہو سکتے ہیں اور ان کے نتیجے میں خاندانی سطح پر بے اختیاری کے مقابلے میں ملکیت کے اختیار کی حالت بہتر زندگی کی غمازی کر سکتی ہے۔ (۱)

پاکستان میں زمین میں سے وراثت کا حصہ خواتین کے لیے ایک پیچیدہ معمہ بن چکا ہے۔اس کے حل کے لیے قانونی اور سماجی سطح پر اصلاحات کی جا چکی ہیں لیکن چونکہ عوامی سطح پر شعور کی بیداری اور مذہبی اصلاح کا کام مثالی نوعیت کا نہیں کیا جارہاہے اس لیے تاحال عملی اعتبار سے مسائل جوں کے توں ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ جب تک خواتین کو زمین کی ملکیت کا حق نہیں دیا جائے گا، ان کی فلاح و بہبود میں انقلابی تبدیلی نہیں آپائے گی۔زمین، مکان یا دکانات کی ملکیت تک خواتین کا اختیار ان کی زندگی کے مجموعی نظام میں بہتری کا سبب ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے جن ممالک میں اس کو ممکن بنایا جاچکا ہے وہاں کے حالات مشرقی ممالک سے مختلف ہیں۔ (۲)

خواتین کی روز مرہ بقا، معاشی تحفظ، جسمانی حفاظت اور شرعی و قانونی ذریعے سے دیے گئے حقوق کی یقینی فراہمی میں جن امور کا اساسی کردار ہے ان میں سے ملکیت پر ان کا اختیار سرفہرست ہے۔

([1]) IFAD, Rural Development Report 2016
https://www.ifad.org/documents/30600024/e8e9e986-2fd9-4ec4-8fe3 77e99af934c4

([2]) Ritu Agarwal Jayesh Prasad, (2007), Are Individual Differences Germane to the Acceptance of New Information Technologies?, Journal of decision Sciences, June

۴ - فیصلہ سازی کا اختیار:

اجتماعی خاندانی نظام میں عموماً خواتین کو تقسیم وراثت کے وقت فیصلہ سازی کے عمل میں شامل نہیں کیا جاتا ہے۔ اگر وہ گھریلو معاملات میں کوئی مشورہ یا تجویز دیں تو عموماً ان کے مشورے کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ افرادِ خانہ میں احساس کمتری کا شکار رہتی ہے۔۔

ترقی پذیر ممالک میں خواتین کے پاس زمینی ملکیت کا حق ہوتا ہے۔ اس سے انہیں مادی و نفسیاری تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ زمین کے ذریعے خوراک اور آمدنی کے حصول کے لیے سرگرمیوں کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ وراثتی حصے کی زمین اگر خواتین کے حوالے کر دی جائے تو اس سے نہ صرف زمین سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے بلکہ خواتین کی اہمیت کو تسلیم کرنے کا معاشرتی رجحان بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ گھریلو یا معاشرتی سطح پر عورتوں اور مردوں میں جنسی امتیاز کے تصورات کا خاتمہ اسی ذریعے سے ممکن ہے۔

اس حوالے سے مصر میں ہونے والے ایک سروے کی رپورٹ کے مطابق مصری معاشرے میں یہ تصور تو موجود ہے کہ اسلام نے عورت کو مالکانہ حقوق دیے ہیں اور گھریلو معاملات میں اس کے مشورے کو اہمیت دی ہے لیکن وہاں عملی طور پر عورت کے پاس ملکیتی اختیارات کا فقدان ہے۔ معاشی معاملات پر مردوں کی اجارہ داری مسلسل قائم ہے جس کی وجہ سے گھریلو سطح پر یا معاشرتی حوالے سے خواتین کو ثانوی درجہ دیا گیا ہے۔ اس سروے رپورٹ میں کچھ ایسی خواتین کا بھی ذکر ہے جنھوں نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے عدالت کے ذریعے وراثت میں اپنا حصہ لیا۔ اس پر ملکیت کا اختیار حاصل کیا اور اس کی بنیاد پر معاشی امور کی انجام دہی کے ذریعے مزید کمائی کی تو نہ صرف خاندانی سطح پر ان کے وقار میں اضافہ ہوا بلکہ روز مرہ کے امور و معاملات میں ان کی تجاویز اور مشوروں کو بھی زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ (۱)

۵ - گھریلو تشدد:

ایک عمومی روایت کے مطابق خواتین اپنے بھائیوں کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر رکھنے یا باقی رکھنے کی غرض سے اپنے وراثتی حصے سے دست برداری کا اعلان کر دیتی ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عموماً اپنے سسرال یا شوہر کے ساتھ ان کے تعلقات بہتر نہیں ہو پاتے جس کی وجہ سے وہ اپنے ازدواجی رشتے کے بارے میں عدم تحفظ کا شکار رہتی ہیں۔ بعض کیسوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شوہر اور سسرال کی طرف سے خاتون خانہ ہمیشہ وراثتی حصے کے حوالے سے طنز

(1) Dewi Haryani Susilastuti, (2003), Women's education, work and autonomy: An Egyptian case, PHD Thesis, Department of Urban and Regional Planning, Florida State University,

کے نشتر بھی سہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ یہ بات بڑھتے بڑھتے جسمانی تشدد تک بھی جا پہنچتی ہے اور عورت زندگی بھر ذہنی دباؤ اور نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا رہتی ہے۔ اس کے تفصیلی حوالے اگلی فصل میں دیے گئے ہیں۔

٦- مستقبل کے بارے میں عدم تحفظ:

مستقبل کے غیر متوقع حالات مثلاً شوہر کی وفات، طلاق، جسمانی عذر یا شوہر کے کاروبار میں نقصان وغیرہ کا سامنا کرنے میں حقِ وراثت کے ذریعے خاتون کو تحفظ کا احساس ملتا ہے۔ وراثت میں ملنے والے حصے کو خواتین اپنے بچوں کی تعلیم پر، گھریلو اخراجات پر، اپنی شخصیت میں خود اعتمادی کرنے یا اپنی بیٹی کی شادی کے انتظامات پر خرچ کر سکتی ہیں۔ اس سے ملنے والا ذہنی اطمنیان معاشرتی زندگی میں خواتین کے اعتماد میں اضافہ کرتا ہے۔ وراثت میں ملنے والی زمین اس ضمن میں سب سے زیادہ طاقت ور اثاثہ ثابت ہوتی ہے جو ہجرت، طلاق یا شوہر کی وفات کی صورت میں پہنچنے والے کسی بھی صدمے کی صورت میں مستقبل کے تحفظ کا احساس دلاتی ہے۔ عصرِ حاضر میں زمین کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اگر خواتین کو ان کا زمینی حقِ وراثت دیا جائے تو مکمل طور پر مردوں پر انحصار کرنے والی خاتون اور اپنی ملکیت کے ذریعے معاشی طور پر مستحکم ہونے والی خاتون کے درمیان واضح فرق پیدا ہو سکتا ہے۔(١)

پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ جن ممالک میں معاشی حالات عدم توازن کا شکار ہیں وہاں عموماً خواتین کو زمین کے وراثتی حق سے محروم رکھا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ان کا احساسِ تحفظ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ اکتساب مال کے لیے زمین کو مختلف سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود عورتوں کی ذہن سازی اس انداز میں کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو خطرے میں ڈال کر حق وراثت سے دست برداری کا ارتکاب کر لیتی ہیں جس کا خمیازہ ان کو زندگی بھر بھگتنا پڑتا ہے۔

٧ - فکری تربیت کا فقدان:

اس میں کوئی شک نہیں کہ خاندان کا ادارہ انسانی زندگی کے تحفظ اور بقا کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک اہم نقطہ ہے کہ خاندان کے ادارے میں توازن برقرار رکھنے کے لیے ہر فرد کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ حقوق کا بھرپور کیال رکھا جائے۔ اس ضمن میں اگر کسی ایک فرد کو اس کے حقوق دے دیے جائیں اور

(1) T. Dyson, M. Moore, (1983), On kinship structure, female autonomy, and demographic behaviour in India. Journal of Population and Development Review, Issue 9, P. 35-60.

دوسرے کو ان حقوق سے کلی یا جزوی طور پر محروم کر دیا جائے تو اس سے معاشرے میں خاندان کی نوعیت یا اہمیت ضرور متاثر ہو سکتی ہے۔ (۱)

زمین اور گھر کی ملکیت پر خواتین کا عدم اختیار اور زمین، فرنیچر، کپڑوں، ذاتی املاک، گھریلو سامان اور نقدی پر جنسی بنیادوں پر مبنی ملکیتی امتیاز بہت زیادہ دیکھا گیا ہے۔ اس نظام میں خواتین کی معاشی بقا سخت خطرات سے دوچار ہے اور ان کو چھوٹی چھوٹی طبی ضروریات کے لیے بھی اپنی عزتِ نفس مجروح کروانی پڑ جاتی ہے۔ (۲)

بین الاقوامی حقوقِ انسانی کے مطابق خواتین بغیر کسی جنسی امتیاز کے جائیداد کی ملکیت کا حق رکھتی ہیں۔ خاندان میں میاں بیوی دونوں ملکیت اور ملکیت کے انتظامی معاملات کے حق میں مساوی سطح پر کھڑے ہیں۔ ان قوانین کی ہر ملک میں تشکیل ہو جانے کے باوجود اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق محض دو فیصد عورتوں کے ان کے وراثتی حقوق دیے گئے ہیں۔

ہندوانہ رسوم کی پیروی میں پاکستان میں جہیز کی لعنت نے اس وراثتی عمل کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ بیٹیوں کو صرف اسی صورت میں وراثت کا حق دیا جاتا ہے اگر بیٹے موجود نہ ہوں۔ ۱۹۵۶ میں بننے والے قانون میں یہ واضح کر دیا گیا کہ جہیز ملنے کے باوجود بیٹی، بہن اور بیوہ ماں کو وراثت میں سے حصہ دیا جائے گا۔ اس کے باوجود عملی سطح پر اس کا نفاذ نظر نہیں آیا ہے اور ابھی بھی والد کی وفات کے بعد اس کی جائیداد پر بیٹوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ تجرباتی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرتی و سماجی رسوم، ملکی قوانین پر بھاری ثابت ہوتی ہیں اور قوانین کی حیثیت محض مثالی ہے۔

قبائلی رسوم بھی خواتین کے وراثتی استحصال کا سبب بنتی ہیں۔ انھیں زندگی کے ایک محدود دائرے میں قید کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ وسائل کے استعمال، ملکیت اور اختیار سے ان کو محروم رکھا جاتا ہے۔ زندگی کے کسی بھی معاملے حتی کہ ان کی اپنی شادی کے سلسلے میں بھی ان کی رائے نہیں لی جاتی ہے۔ ذرا سی جنبش ہونے پر ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ زرعی معاملات میں خواتین مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتی ہیں لیکن ان کا یہ کردار کسی بھی سطح پر تا حال باقاعدہ طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

قابلِ حیرت بات یہ ہے کہ عموماً قبائلی لوگ مذہبی معاملات کے زیادہ پابند نظر آتے ہیں۔ اسلام نے خواتین کو ان کے حقوقِ وراثت سے سرفراز کر رکھا ہے اس لیے قبائلی علاقوں میں ان حقوق کی فراہمی کی توقع زیادہ کی جاتی ہے لیکن اس حوالے سے وہاں کے حالات تشویش ناک ہیں۔ بیوہ کے حق وراثت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ بھائیوں کی

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: Leach Edmund, Social Anthropology, Fontana Press, (1986)

(2) Steinzor, (2003), Women's property and inheritance rights, improving lives in a changing time, USAID, Washington

جانب سے بہن کی شادی کر دینے کے بعد اس کو اپنے کاندان کا حصہ نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ سسرال کا فرد قرار پاتی ہے۔[1]

والد کی وفات کے بعد اگر بہن کو وراثت میں سے حصہ مل بھی جائے تو اس کو اپنا حصہ اپنے بھائی کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کے لیے چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ بصورت دیگر بھائی کے ساتھ قطع تعلقی کی صورت میں اس کے اپنے بچوں کی زندگی مسائل کا شکار ہو جاتی ہے کیونکہ اس صورت میں اس کی بیٹیاں بھی مستقل میں اپنے حق وراثت کی حق دار قرار پاتی ہیں جس سے اس کے بیٹوں کے مالکانہ اختیارات متاثر ہو سکتے ہیں۔

۲ - تحقیقی سروے رپورٹ:

۱-بنیادی سوالات:

سروے کے بنیادی مسائل جن کے بارے میں عوامی خیالات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

خواتین کے وراثتی حقوق کے بارے میں لوگوں کے تصورات کیا ہیں؟

خواتین کے حقوقِ وراثت سے محرومی کے اہم اسباب کون کون سے ہیں؟

حقوقِ وراثت سے محرومی کے ان کی زندگی پر کون کون سے اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

۲-مفروضہ:

خواتین اپنے وراثتی حقوق سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔

معاشرتی اور سماجی روایات کی بنا پر خواتین کو زبردستی حقِ وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے۔

حقِ وراثت سے محرومی کی صورت میں خواتین کی زندگی گوناں گوں مسائل سے دوچار ہوتی ہے۔

۳-سروے کا مقصد:

حق کے وراثتی حقوق سے متعلق معاشرتی تصور اور شعور کا جائزہ لینا۔

حق وراثت سے خواتین کی محروم کے اسباب کو سامنے لانا۔

([1]) Mumtaz Anwar,(2006), The Political Economy of International Financial Institutions' Lending to Pakistan, Hamburgisches Welt-Wirtschafts-Archiv (HWWA), Hamburg Institute of International Economics, p 338

حقِ وراثت سے محرومی کی صورت میں خواتین کی زندگی پر پڑنے والے اثرات سے پردہ اٹھانا۔

۴- طریقہ تحقیق:

سماجی علوم کی سطح پر سروے کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ تحقیقی خاکہ تفصیلات کی روشنی میں محقق کے کے تحقیقی اسلوب کو واضح کرتا ہے۔ سروے سے متعلقہ تحقیق کے دو حصے ہیں:

۵ - منصوبہ (Planning):

اس مرحلے میں محقق اپنی تحقیق کا ڈیزائن تیار کرتا ہے جس میں تحقیق کا مکمل منصوبہ پیش کیا جاتا ہے۔ تحقیقی خاکہ قدم بقدم معلومات جمع کرنے کے طریقے کے حوالے سے محقق کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کی مدد سے یہ یقین کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ کون سا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے اور آگے کس مرحلے میں داخل ہونا ہے۔ (۱)

۶ - عمل (Execution):

دوسرے مرحلے میں منصوبے کے مطابق اعداد و شمار جمع کر کے ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

حالیہ سروے میں معلومات جمع کرنے کے لیے Qualitative اور Quantitative طریقہ اختیار کرتے ہوئے معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں ایک سوال نامہ تیار کر کے اس کی مدد سے خواتین سے معلومات جمع کی گئی ہیں۔ان خواتین کا تعلق راولپنڈی، ٹیکسلا اور چکوال سے ہے۔ان خواتین سے انٹرویو کی صورت میں سوالات پوچھے گئے اور ان کے جوابات کی مدد سے معلومات جمع کی گئی ہیں۔پڑھی لکھی خواتین کو سوال نامہ دیا گیا اور انھوں نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد سوالات کے سامنے جوابات کی نشاندہی کی تھی۔سوالات اردو زبان میں لکھے گئے تھے اور ان کی زبان آسان اور جملوں کی نوعیت سلیس تھی۔انٹرویو کا طریقہ کار اختیار کرنے کا سبب یہ تھا کہ جواب دہندہ تک سوال کے مفہوم کو صحیح اور واضح انداز میں پہنچایا جائے تا کہ اس کے لیے سوال کی نوعیت کو سمجھنا آسان ہو۔محققہ نے انٹرویو کے دوران ایسے کئی سوالات کی وضاحت بھی کی جن کو سمجھنے میں جواب دہندگان کو دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

([1]) Linda K. Owens,(2002), introduction to survey research design, SRL Fall, Seminar Series, http://www.srl.uic.edu/seminars/Intro/Intro_to_survey_design.pdf

۷ - تجرباتی سروے:

تحقیقی سوالنامے کی افادیت کی جانچ کے لیے تفصیلی سروے سے قبل ایک تجرباتی سروے کیا جاتا ہے جس کی مدد سے معلوم ہوتا ہے کہ سوالنامہ اپنے موضوع کے حوالے سے کس حد تک موثر ہے۔اس دوران اگر سوال نامے میں کوئی قابل اصلاح پہلو نظر آئے تو اس کی اصلاح کی جاتی ہے نیز اگر کسی سوال کا اضافہ کرنے یا کسی سوال کو حذف کرنا ضروری معلوم ہو تو اس کو ختم بھی کیا جاتا ہے۔اس مشق کے کا مقصد سوال نامے کی جانچ پڑتال ہوتا ہے اور اس کو Pre Test کہا جاتا ہے۔حالیہ سروے میں Pre Test کے لیے سات لوگوں کے انٹرویو کیے گئے تھے جن کے دوران کچھ اہم نکات سامنے آئے اور ان کی روشنی میں سوالات کی تشکیلِ نو اور ترتیبِ نو کی گئی تھی۔چنانچہ مطلوبہ ترامیم کے بعد فیلڈ سروے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔

۸ - شماریاتی تجزیہ:

حاصل ہونے والی معلومات کا شماریاتی تجزیہ انتہائی منظم ٹیبل کی مدد سے کیا گیا تھا۔اس ضمن میں کمپیوٹر کے جن سافٹ وئیرز کا استعمال کیا جاتا ہے ان میں SATA[۱], SPSS[۲] اور SAS[۳] شامل ہیں۔محققہ نے ان میں سے SPSS کا انتخاب کیا کیونکہ سوشل سائنسز میں تحقیقی مقاصد کے لیے زیادہ تر اسی سے استفادہ کیا جاتا ہے۔سروے کی افادیت میں اضافہ کرنے کے لیے اعداد و شمار کو تحقیق کے مقاصد کی روشنی میں جانچا گیا اور SPSS کی مدد سے ہر پہلو کا فی صد کے اعتبار سے نتائج کے ساتھ ربط قائم کیا گیا تھا۔معلومات کو ٹیبل کی صورت میں پیش کیا گیا اور جغرافیائی پیش کش کو تفصیلی تعبیرات کے ساتھ نمایاں کی گیا تھا۔

۹ - معلومات کی رمز بندی(Coding of questionnaire):

سروے سے حاصل کی گئی معلومات کو تحقیقی عمل کے دوران رمز بندی میں منتقل کیا جاتا ہے۔سوال نامے کی مدد سے ملنے والے جوابات کو ان رموز میں تبدیل کیا جاتا ہے جن کو کمپیوٹر کا سافٹ وئیر سمجھ سکتا ہے۔اس کے نتیجے میں تحقیقی عمل کے دوران غلطی کے امکانات کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔اس سروے سے حاصل ہونے والی معلومات کو بھی

([1]) SATA (Software Architectural Transformation Algorithm)

([2]) IBM SPSS Statistics.

([3]) SAS (Statistical Analysis System)

محققہ نے آبادی اور شماریات کے اعتبار سے کمپیوٹر کی رمزیت کے مطابق تبدیل کیا تھا اور اس کی مدد سے حاصل ہونے والے نتائج کیا تجزیہ کیا گیا ہے۔

۱۰ - ترتیبِ اعداد و شمار(Tabulation of statistics):

مختلف زمرہ جات میں اعداد و شمار کو تقسیم کرنے کے بعد اس کو ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جس کو Tabulation کہا جاتا ہے۔ سطور کو افقی جب کہ کالموں کو عمودی انداز میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ زمرہ کی نوعیت کے مطابق یہ یک سطری یا یک کالمی کے علاوہ دو سطری اور دو کالمی یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔ حالیہ سروے سے حاصل کی گئی معلومات کو ایک ایسے گراف میں پیش کیا گیا ہے جو تعداد اور فیصد دونوں کی سوالنامے میں دی گئی ترتیب کے حوالے سے تنظیمی پیشکش کرتا ہے۔

۱۱ - سروے کے دوران پیش آمدہ مسائل:

تجرباتی سروے کے بعد محققہ نے راولپنڈی کے کئی علاقوں کا دورہ کیا تا کہ سوال نامے کی مدد سے خواتین سے معلومات جمع کی جا سکیں۔ اس دوران کئی مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑا جن میں:

متعدد علاقوں کی طرف جانے کے لیے محققہ کو ذرائع آمد و رفت کا فقدان ملا۔ وہاں پہنچنے کے لیے ٹیکسی انتہائی مہنگی ثابت ہوئی ہے۔

بعض خواتین انٹرویو دینے کے لیے آمادہ نہ ہو رہی تھیں۔ انھیں یہ خوف لاحق تھا کہ اگر ان کی فراہم کردہ معلومات کے بارے مین ان کے خاندان کے مردوں کو معلوم ہو گیا تو انھیں متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

بعض خواتین کو قائل کر تو لیا لیکن ان کی طرف سے خوف کے سبب غلط معلومات بھی فراہم کی گئیں تا کہ اگر ان کے انٹرویو کے بارے میں کسی کو علم ہو جائے تو بھی ان کی فراہم کی گئی معلومات کی بنا پر ان کے لیے کوئی مشکل نہ کھڑی ہو سکے۔

خواتین میں خواندگی کے فقدان کے باعث ان کے لیے سروے کی نوعیت کو سمجھنا انتہائی مشکل تھا۔ توضیحی گفتگو کے ذریعے ان کو باور کروایا گیا کہ انٹرویو سے حاصل کی گئی معلومات کو محض تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا اور اس کی وجہ سے ان کی ذاتی، خاندانی یا معاشرتی زندگی پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہو گا۔

۱۲ - سروے کا سوال نامہ:

جواب دہندہ نمبر:

۱۔جواب دہندہ کی عمر:____________________

۲۔جواب دہندہ کی جنس:____________________

۳۔جواب دہندہ کی تعلیم:____________________

۴۔کیا آپ خواتین کے وراثتی حقوق سے متعلق آگاہ ہیں؟:____________________

۵۔کیا آپ حقوقِ وراثت سے متعلق اسلامی نظام سے آگاہ ہیں؟:____________________

۶۔معاشرہ خواتین کو وراثتی حقوق دینے میں متردد کیوں ہے؟____________________

۷۔ کیا آپ پاکستان میں حقوق وراثت کے قانون کے اطلاق سے مطمئن ہیں؟

۱۔جی ہاں ۲۔جی نہیں ۳۔معتدل

۸۔ کیاوراثتی حوالے سے مروج سماجی رسوم اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں؟

۱۔جی ہاں ۲۔جی نہیں ۳۔معتدل

۹۔ حق طلبی کے نتیجے میں خواتین کو معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہے یا برا سمجھا جاتا ہے؟

۱۔اچھا سمجھا جاتا ہے۔ ۲۔برا سمجھا جاتا ہے ۳۔معتدل

۱۰۔ وراثتی قانون کے اطلاق کے حوالے سے قانونی اداروں کی کارکردگی کس حد تک تسلی بخش ہے؟

۱۔مکمل تسلی بخش ۲۔جزوی تسلی بخش ۳۔غیر تسلی بخش

۱۱۔خواتین کی وراثت سے محرومی کا بنیادی سبب کیا ہے؟

۱۔ریاستی قانون ۲۔معاشرتی رسوم ۳۔مذہبی قوانین

۱۲۔ کیا عورت کو حق وراثت سے دست بردار ہو جانا چاہیے؟

۱۔جی ہاں ۲۔جی نہیں ۳۔معتدل

۱۳۔ کیا مردشاہی نظام عورتوں وراثتی استحصال کا ذمہ دار ہے؟

۱۔جی ہاں ۲۔جی نہیں ۳۔معتدل

۱۴۔ کیا ریاستی قانون عورتوں کے وراثتی حق کے حوالے سے تسلی بخش ہے؟

۱۔جی ہاں ۲۔جی نہیں ۳۔معتدل

۱۵۔ عورتوں کے حق وراثت کے استحصال کا اہم ذمہ دار کون ہے؟

ا. عورت کا خاندان

۲. عورت خود

۳. ثقافتی رسوم

۴. حکومت

۵. عورت اور خاندان دونوں

۱۶۔ خواتین اپنے حق وراثت سے خود دست بردار کیوں ہو جاتی ہیں؟

۱. بدنامی کے خوف سے

۲. والدین کی تربیت کی وجہ سے

۳. میکے کی قطع تعلقی کے خوف سے

۴. شوہر پر بھائی کو ترجیح دینے کی وجہ سے

۵. تعلیم کے فقدان کی وجہ سے

۶. سماجی قطع تعلقی کے خوف سے

۷. بھائیوں کی محبت کے دروس کی تاثیر کی وجہ سے

۱۷۔ کیا لڑکی کے جہیز کے اخراجات کو حق وراثت کا نعم البدل سمجھا جاسکتا ہے؟

۱۔جی ہاں ۲۔جی نہیں ۳۔معتدل

۱۸۔ کیا حق وراثت سے محرومی کے سبب خواتین کو مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

۱۔جی ہاں ۲۔جی نہیں ۳۔معتدل

۱۹۔ آپ کے علاقے میں حق وراثت محروم خواتین کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے؟

۱. مردوں پر انحصار بڑھ گیا ہے۔

۲. معاشرتی زندگی میں ان کی بے بسی میں اضافہ ہوا ہے۔

۳. معاشرے میں ان کا مقام و مرتبہ منفی اعتبار سے متاثر ہوا ہے۔

۴. بیوگی کے بعد مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔

۵. معاشرتی اور معاشی، دونوں اعتبار سے مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔

۶. نفسیاتی امراض لاحق ہوئے ہیں۔

۲۰۔ حق وراثت سے محروم کر دینے کے بعد بھائیوں کا بہنوں کے ساتھ رویہ کس طرح کا ہوتا ہے؟

۱۔معاون رویہ ہوتا ہے۔ ۲۔غیر معاون رویہ ہوتا ہے ۳۔معتدل

۲۱۔ کیا حق وراثت سے محروم ہونے والی خواتین کو گھریلو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے؟

ا۔جی ہاں ۲۔جی نہیں ۳۔معتدل

۲۲۔ حق وراثت سے محروم خاتون کو سسرال میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

ا. احترام سے محرومی ۲۔ فیصلہ سازی کے عمل سے اخراج ۳۔ سسرال میں خود اعتمادی کا فقدان

۴۔ سسرالی معاشرے میں کمتری کا سامنا

۲۳۔ وراثت میں حق حاصل کرنے والی خواتین کو کون سے فوائد حاصل ہوتے ہیں؟

ا. نفسیاتی تحفظ

۲. مزید آمدنی کے ذرائع کا حصول

۳. معاشی ضروریات کے لیے مردوں پر انحصار کا خاتمہ

۴. جواب دہندگان کی عمریں

جن لوگوں کو سروے میں گفتگو کا حصہ بنایا گیا ان کی عمریں مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ تھیں۔

ٹیبل:۱			
عمر	تعداد	فیصد	مجموعی تعداد (فیصد میں)
۲۵-۲۹	۳۰	۱۰	۱۰
۳۰-۳۴	۳۰	۱۰	۲۰
۳۵-۳۹	۱۱۰	۳۷	۵۷
۴۰-۴۴	۷۵	۲۵	۸۲
۴۵-۴۹	۱۵	۵	۸۷
۵۰-۵۴	۴۰	۱۳	۱۰۰
کل	۳۰۰	۱۰۰	==

مذکورہ ٹیبل میں جواب دہندگان کی عمروں کا ذکر ہے جس کے مطابق:

۲۵ تا ۲۹ سال کے جواب دہندگان کی تعداد ۳۰ (۱۰ فیصد)، ۳۰ تا ۳۴ برس کے جواب دہندگان کی تعداد ۳۰ (۱۰ فیصد)، ۳۵ تا ۳۹ برس کی عمر کے جواب دہندگان کی تعداد ۱۱۰ (۳۷ فیصد)، ۴۰ تا ۴۴ برس کی عمر کے جواب دہندگان کی تعداد ۷۵ (۲۵ فیصد)، ۴۵ تا ۴۹ برس کے جواب دہندگان کی تعداد ۱۵ (۵ فیصد)، جب کہ ۵۰ تا ۵۵ برس کے جواب دہندگان کی تعداد ۴۰ (۱۳ فیصد) تھی۔

معلومات کے اس نمائشی ٹیبل کی مدد سے معلوم ہوتا ہے کہ جواب دہندگان میں زیادہ تعداد (۳۷ فیصد) ان لوگوں کی تھی جن کی عمر ۳۵ تا ۳۹ برس ہے۔

جواب دہندگان میں مردوں اور عورتوں کی تعداد:

ٹیبل:۲			
جنس	تعداد	فیصد	مجموعی تعداد (فیصد میں)
مرد	۱۴۱	۴۷	۴۷
خواتین	۱۵۹	۵۳	۱۰۰
کل	۳۰۰	۱۰۰	==

ٹیبل نمبر ۲ میں جواب دہندگان کی تقسیم تذکیر و تانیث کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اس میں مردوں اور عورتوں کو اس لیے شامل کیا گیا تھا تاکہ دونوں میں وراثتی مسائل کے حوالے سے شعور کا جائزہ لیا جاسکے اور یہ معلوم کیا جاسکے کہ خواتین کو وراثت سے محروم کرنے کے اسباب کیا ہیں۔ ٹیبل میں پیش کردہ شماریات سے معلوم ہوتا ہے کہ جواب دہندگان میں سے مردوں کی تعداد ۱۴۱ (۴۷ فیصد) جب کہ عورتوں کی تعداد ۱۵۹ (۵۳ فیصد) تھی۔

جواب دہندگان کی تعلیمی قابلیت

ٹیبل:۳			
تعلیمی سطح	تعداد	فیصد	مجموعی تعداد (فیصد میں)
ناخواندہ	۳۶	۱۲	۱۲
پرائمری	۳۰	۱۰	۲۲
مڈل	۲۴	۸	۳۰
میٹرک	۹۵	۳۲	۶۲
ایف اے	۳۵	۱۲	۷۳
بی اے	۳۵	۱۲	۸۵
ایم اے	۴۵	۱۵	۱۰۰
کل	۳۰۰	۱۰۰	==

مذکورہ ٹیبل میں جواب دہندگان کی تعلیمی قابلیت بیان کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناخواندہ جواب دہندگان کی تعداد ۳۶ (۱۲ فیصد)، پرائمری پاس جواب دہندگان کی تعداد ۳۰ (۱۰ فیصد)، مڈل پاس جواب دہندگان کی

تعداد ۲۴ (۸ فیصد)، میٹرک پاس جواب دہندگان کی تعداد ۹۵ (۳۲ فیصد)، ایف پاس جواب دہندگان کی تعداد ۳۵ (۱۲ فیصد)، بی اے پاس جواب دہندگان کی تعداد ۳۵ (۱۲ فیصد)، ایم اے پاس جواب دہندگان کی تعداد ۴۵ (۱۵ فیصد) ہے۔ زیادہ تر جواب دہندگان میٹرک پاس ہیں۔

خواتین کے وراثتی حقوق کے متعلق آگاہ جواب دہندگان:

ٹیبل:۴			
جواب دہندہ	تعداد	فیصد	مجموعی تعداد (فیصد میں)
آگاہ جواب دہندگان	۲۹۴	۹۸	۹۸
لاعلم جواب دہندگان	۶	۲	۱۰۰
کل	۳۰۰	۱۰۰	==

مذکورہ ٹیبل میں خواتین کے حق وراثت کا علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے جواب دہندگان کی تعداد کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق ۹۸ فیصد لوگ وراثت میں خواتین کے حصے کا عمومی فہم رکھتے ہیں۔ انتہائی کم لوگ، جن کی تعداد دو فیصد تک ہے، اس سے بے خبر ہیں۔

حقوقِ وراثت سے متعلق اسلامی نظام کا تصور:

ٹیبل:۵			
جواب دہندہ	تعداد	فیصد	مجموعی تعداد (فیصد میں)
آگاہ جواب دہندگان	۲۴۶	۸۲	۸۲
لاعلم جواب دہندگان	۵۴	۱۸	۱۰۰
کل	۳۰۰	۱۰۰	==

مذکورہ ٹیبل کے مطابق ۸۲ فیصد جواب دہندگان خواتین کے وراثتی حقوق کے بارے میں عمومی تصورات رکھتے ہیں اور ان کو اسلام میں خواتین کے وراثتی حقوق کے بارے میں کسی حد تک علم ہے۔ باقی ۱۸ فیصد لوگوں نے جواب میں بتایا کہ انھیں اسلام کے نظامِ تقسیم وراثت کی مبادیات اور تفصیلات سے آگاہی حاصل نہیں ہے۔ خواتین کے لیے اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں وراثت حصوں کا تعین کیا جا چکا ہے جس کی تفصیل اس مقالہ کے دوسرے باب میں دی گئی ہے۔

حقوقِ وراثت کے قانون کا عملی اطلاق:

سروے کے دوراں پاکستانی قانونِ وراثت کے عملی نفاذ سے متعلق بھی لوگوں کی آراء جاننے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں ۵۸ فیصد جواب دہندگان نے یہ خیال ظاہر کیا کہ پاکستانی معاشرے میں اسلام اور قانون کی طرف سے مقرر کیے گئے خواتین کے وراثتی حقوق کا عملی نفاذ نہیں ہوا ہے۔۱۰ فیصد افراد کا اس سے اختلاف سامنے آیا اور انھوں نے قانونِ وراثت کے اطلاق کے بارے میں تسلی کا اظہار کیا جب کہ ۳۲ فیصد لوگوں کے اس قانون کے عملی اطلاق کے بارے میں واضح ااور دوٹوک انداز میں اپنی رائے نہیں دی تھی۔

ٹیبل:٦			
جواب دہندہ	تعداد	فیصد	مجموعی تعداد (فیصد میں)
مطمئن	۱۷۴	۵۸	۵۸
غیر مطمئن	۳۰	۱۰	٦۸
معتدل	۹٦	۳۲	۱۰۰
کل	۳۰۰	۱۰۰	==

۴ -خلاصہ و نتائج:

خواتین کے معاشی تحفظ اور ان کی خود اعتمادی کی تشکیل میں حق وراثت کے طور پر ملنے والے مالک کا کلیدی کردار ہے۔اس کی مدد سے سسرال اور معاشرے میں ان کا مقام و مرتبہ بڑھتا ہے۔خواتین کا حق وراثت ان کے معاشرتی و معاشی استحکام کی ضمانت ہے۔امور وراثت میں خواتین کا استحصال پاکستانی معاشرے میں معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔بیٹیاں بھی خاندان کا اسی طرح حصہ ہوتی ہیں جس طرح بیٹے خاندان کا حصہ ہوتے ہیں اس لیے کسی ایک بیٹی یا سب بیٹیوں کو خاندانی وراثت کے حصوں سے محروم کر دیا جائے تو یہ اس کے ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی قتل کے مترادف ہے۔اسلام اور پاکستان کا قانون خواتین کے وراثتی حق کی فراہمی کے لیے مکمل طور پر مدو معاون کردار ادا کرتا ہے لیکن افسوس ناک حالت اس وقت بن جاتی ہے جب خواتین لاعلمی، مردشاہی نظام، سماجی رسوم، زمین سے متعلقہ پیچیدہ قانون اور اس قانون کے نفاذ کے لیے غیر میکانکی اور کمزور طریقہ کار کی بنا پر اپنے حق سے محروم ہو جاتی ہیں۔سماجی رسوم اور مردشاہی نظام معاشرت کی بنا پر خواتین کو خاندان کے مردوں کے حق میں حق وراثت سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے جس سے خواتین کی معاشی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔یہ تمام امور اس امر کے شاہد ہیں کہ پاکستانی معاشرے میں خواتین کو اسلام کا تفویض کردہ مقام و مرتبہ فراہم نہیں کیا گیا ہے۔

زمین پر مالکانہ دسترس، اختیار، گھر کی ملکیت وغیرہ عورتوں کے مجموعی نظامِ زندگی کے حوالے سے انتہائی اہم ہیں۔عورتوں کی روز مرہ کی بقا، معاشی تحفظ، جسمانی حفاظت کے ساتھ ساتھ معاشرے میں مردوں کے مقابلے میں مساوی حقوق کا حصول ان کے حق وراثت کے ساتھ مربوط ہے۔جن عورتوں کو یہ حق نہیں دیا جاتا ہے انھیں معاشرتی اور معاشی دونوں حوالوں سے مشکلات کا سامنا کرنا پرتا ہے۔انھیں ہر لحہ بے چارگی کا احساس ہوتا ہے اور گھریلو امور سے متعلق فیصلہ سازی میں ان کی کسی بھی تجویز کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔

وہ خواتین جن کو وراثت کا حق دیا جاتا ہے ان کے ساتھ سسرال میں بہتر سلوک کیا جاتا ہے۔اس عزت و احترام سے معمور رویے کی بناپر ان کی خوداعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ خود مختاری کی حامل بن جاتی ہیں۔انہیں جس استحکام کی ضرورت ہوتی ہے اس کا تعلق ذہنی، جسمانی، خاندانی، معاشرتی اور معاشی زندگی کے ساتھ ہے اور اس کی یقین دہانی کے لیے وراثت کا حق اساسی کردار ادا کرتا ہے۔سروے کے دوران ان خواتین کو زیادہ مستحکم دیکھا گیا ہے جن کے میکے کی جانب سے ان کو وراثت کا حق دیا جاتا ہے۔دوسری جانب حق وراثت سے محروم خواتین کو سروے کے دوران سسرال میں انتہائی ناگفتہ بہ حالات کا سامنا کرتے ہوئے پایا گیا ہے۔ان کو نظر انداز کرنے میں صرف سسرال ہی نہیں بلکہ ان کے شوہر بھی ایک ہی راستے پر چلتے ہوئے پائے گئے ہیں۔

یہ سروے معاشرے میں خواتین کے وراثتی حقوق کے حوالے سے پیش آمدہ مسائل سے متعلق لوگوں کے شعور اور فکر سے آگاہ ہونے کے لیے کیا گیا تھا۔اس میں یہ پتہ چلانے کی کوشش کی گئی کہ آخر خواتین اپنے حق وراثت سے دست بردار کیوں ہو جاتی ہیں۔حق وراثت سے دست بردار ہو جانے یا محروم ہو جانے کے بعد ان کو خاندانی، سماجی اور معاشی اعتبار سے کن مسائل کا سامنا کرنا پرتا ہے۔سروے سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین معاشرتی رسوم و رواج کی چکی میں پس رہی ہیں۔۹۸ فیصد لوگ ایسے ملے ہیں جو نظامِ وراثت سے آگاہ ہیں۔ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ خواتین کے لیے اسلام نے وراثتی حصوں کا تعین کر رکھا ہے۔زیادہ تر لوگوں نے اقرار کیا ہے کہ اسلام اور پاکستانی قانون عورتوں کو ان کے حق وراثت کی فراہمی تاکید کرتا ہے لکن پاکستانی معاشرے میں پنپتی ہوئی رسول اور رواج نے اس کے سامنے بند باندھ رکھا ہے۔تقریباً۳۳ فیصد لوگوں نے اقرار کیا کہ حق وراثت کی فراہمی کی وجہ سے عورتوں کی زندگی میں بہت آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اور انہیں اپنی معاشرتی زندگی میں ضروریات کے حوالے سے سہولت مل سکتی ہے۔حق وراثت عورتوں کی خود مختاری کی علامت ہے اور زندگی میں کسی بھی ناگہانی آفت سے نبرد آزما ہونے میں عورت کا وراثتی حق اس کے لیے انتہائی مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

۷۲ فیصد جواب دہندگان کے جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ مردشاہی نظام عورتوں کو ان کے وراثتی حق سے محروم رکھنے میں اساسی کردار ادا کرتا ہے۔اس نظام کا مقصد مردوں کے حقوق اور ملکیت کو خواتین کے حقوق پر تفوق

دیناہے۔ مرد شاہی معاشرے میں مردوں کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ عورتوں پر حاوی رہیں اور اسی کوشش میں وہ عورتوں کے ان کے حق وراثت سے محروم کر دیتے ہیں۔۳۸ فیصد لوگوں کا کیال ہے کہ سماجی رسوم عورتوں کو وراثت سے محروم کرنے کا سبب ہیں۔ان رسوم میں جہیز سب سے اہم سمجھا جاتا ہے اور ایک مرتبہ جہیز اور شادی پر خرچا کرنے کے بعد بیٹی کو حق وراثت سے محروم کر دینا عین منطقی اور معقول خیال کیا جاتا ہے۔اس عمل کے پیچھے یہ سوچ بھی کار فرما ہے کہ اباؤ اجداد کی جائیداد کو خاندان کے اندر ہی رہنا چاہیے۔

۵۵ فیصد جواب دہندگان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاستی قانون بھی خواتین کو حق وراثت سے محروم رکھنے میں ذمہ دار ہے۔ عورتوں کے وراثتی حق کے بارے میں قانون تو بنایا جاچکا ہے لیکن اس کے نفاذ اور اطلاق کا کوئی طریقہ کار تاحال وضع نہیں کیا جاسکا ہے۔

۶۷ فیصد لوگوں نے حق وراثت سے محرومی کی صورت میں خواتین کو مسائل میں مبتلا ہونے کا اقرار کیا ہے۔ ۳۲ فیصد جواب دہندگان کا خیال ہے کہ حق وراثت سے محروم ہونے کی صورت میں خواتین معاشرے میں کم تر درجے پر سمجھی جاتی ہیں۔ مردوں پر ان کا انحصار بڑھ جاتا ہے اور مردوں پر مکمل طور پر منحصر ہونے کی صورت میں وہ معاشرتی تحفظات میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

۶۳ فیصد جواب دہندگان کے مطابق ان خواتین کو گھریلو تشدد کا نشانہ بننا پڑتا ہے جن کو ان کا وراثتی حق نہیں دیا جاتا ہے۔ ۵۱ فیصد لوگوں کے مطابق ازدواجی زندگی میں وراثت سے محروم عورت کو مسائل و مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ خود اعتمادی کے فقدان میں مبتلا ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے گھریلو امور مین مطلوب کردار ادا کرنے سے قاصر ہو جاتی ہیں۔

خواتین کے حق وراثت کے بارے میں درجنوں تحریرین سامنے آچکی ہیں لیکن حق وراثت سے محرومی کے باعث ان کی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کی طرف توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سروے میں مذکورہ خلاء کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ اس سروے کا مقصد حق وراثت سے محرومی کے اسباب اور نتائج تھا۔

☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

۱. محمد صدیق خان، (س۔ن)، جدید دنیا میں اسلامی قوانین اور خواتین۔ بین الاقوامی کانفرنس، جائنٹ فورم، اسلام آباد

۲. اصغر حسین دیوبندی، (۱۳۴۹ھ)، مفید الوارثین، دہلی، انڈیا۔

۳. ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، (۱۹۹۴ء)، السنن، تحقیق: شعیب الارنؤوط، دار الفکر، بیروت

4. Bina Agarwal, (1998), Widows versus Daughters or Widows as Daughters? Property, Land and Economic Security in Rural India, Journal of modern Asian studies
5. M. Hammadur Rahman, Kazi Naoroze, (2007), Women Empowerment through Participation in Aquaculture, Journal of Social Science.
6. Uttar Pradesh, Poverty, Growth and Inequality, (PDF). worldbank.org. World Bank Group. Retrieved 15 July 2019.
7. Paul Bate, (1990), Using the culture concept in an organization development setting, Journal of Applied Behavioral Science
8. Clement Allan Tisdell, K.C. Roy, Property rights in women's empowerment , International Journal of Social Economics, April (2002), Vol: 29
9. Atif Abbasi, Saqib Hameed, Asif Iqbal, Amber Arooj, Wafa Hussain, Sheeba Arooj, (2013), Paid Work & Decision Making Power of Married Women Cross Sectional Survey of Muzaffarabad Azad State of Jammu & Kashmir, Journal of Advances in Applied Sociology, June 28, Vol.3 No.3
10. IFAD, Rural Development Report 2016
11. https://www.ifad.org/documents/30600024/e8e9e986-2fd9-4ec4-8fe3 77e99af934c4
12. Ritu Agarwal Jayesh Prasad, (2007), Are Individual Differences Germane to the Acceptance of New Information Technologies?, Journal of decision Sciences, June
13. Dewi Haryani Susilastuti, (2003), Women's education, work and autonomy: An Egyptian case, PHD Thesis, Department of Urban and Regional Planning, Florida State University,
14. T. Dyson, M. Moore, (1983), On kinship structure, female autonomy, and demographic behaviour in India. Journal of Population and Development Review, Issue 9
15. Leach Edmund, Social Anthropology, Fontana Press, (1986)
16. Steinzor, (2003), Women’s property and inheritance rights, improving lives in a changing time, USAID, Washington
17. Mumtaz Anwar,(2006), The Political Economy of International Financial Institutions' Lending to Pakistan, Hamburgisches Welt-Wirtschafts-Archiv (HWWA), Hamburg Institute of International Economics
18. Linda K. Owens,(2002), introduction to survey research design, SRL Fall, Seminar Series, http://www.srl.uic.edu/seminars/Intro/Intro_to_survey_design.pdf
19. SATA (Software Architectural Transformation Algorithm)
20. IBM SPSS Statistics.
21. SAS (Statistical Analysis System)